مونوگراف
میر تقی میر
پروفیسر مظفر حنفی
Aurang Zeb Qasmi
Subject specialist
GHSS QASMI Mardan

مونوگراف

میرتقی میر

میرتقی میر

پروفیسر مظفر حنفی

اردو اکادمی، دہلی

Monograph

Meer Taqi Meer

By

Prof. Muzaffar Hanfi

Pub. by
URDU ACADEMY, DELHI

Print
2009
Rs.50

ضابطہ

سن اشاعت

۲۰۰۹ء

۵۰/روپے

اصیلا آفسیٹ پریس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-170-4

ترتیب

☆☆☆

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوان اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیر نظر مونوگراف اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں اردو اکادمی نے ادب عالیہ کے حوالے سے کلاسیکی ادبا و شعراء کے مختصر حالات زندگی اور ان کی منتخب تحریروں کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ نئی نسل ہمارے مشاہیر کے حیات اور کارناموں سے واقف ہوسکے۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اکادمی کے اشاعتی شیڈول کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا اور ان قلم کاروں کو مونوگراف تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی جو ادب کے میدان میں اپنی شناخت قائم کرچکے ہیں۔ میں اس کتاب کے مصنف کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بڑی محنت لگن اور دلجمعی کے ساتھ اس کام کو مکمل کیا اور ہماری درخواست پر اس ذمہ داری کو بھی خود ہی ادا کیا کہ کتاب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ بھی اپنی نگرانی میں کرائی۔ ان کی اس محنت نے اکادمی کے اشاعتی ذخیرے میں بیش قیمتی اضافہ کیا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیر نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

مرغوب حیدر عابدی

سکریٹری

پیش لفظ

ادب عالیہ (کلاسیک) کیا ہے؟ اس کا تشخص کن اوصاف وعناصر سے ہوتا یا ہوسکتا ہے؟ ادب عالیہ، رومانوی ادب یا جدید ادب کے درمیان کوئی ایسی حد فاصل ہے یا ہوسکتی ہے جو ان کی آزاد اور علیحدہ شناخت قائم کرسکے؟ ان سوالات پر خاصی بحث ہوچکی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے شاید اسی نزاع کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ اصطلاحیں (کلاسیک۔ رومانٹک) ادب کی سیاست سے تعلق رکھتی ہیں اور ایسے جذبات کو ابھارتی ہیں جنھیں ہوا کا دیوتا اپنی زنبیل ہی میں رکھے تو مناسب ہوگا۔

یہ دراصل برطانوی نوآبادیاتی شکنجہ تھا جس کے تحت ہم نے اپنے کلچر اور ادب کے مظاہر کو ایسے نام دیے جو انگریزی کی مستند لغات میں مستعمل تھے اور ان سے وہی معنی ومفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جو ان لغات میں درج تھے۔ ان میں ایک اصطلاح کلاسیک تھی جس کا ترجمہ 'ادب عالیہ' زیادہ پسندیدہ سمجھا گیا۔ حالاں کہ ادب کے طلبا نے اس سے جو مراد لی وہ تھی قدما کا تخلیق کردہ وہ ادب جو پختگی فن اور جمالیاتی لطف وانبساط کے ساتھ دوامی اوصاف کا حامل ہو۔ جو ایک زندہ روایت کا درجہ حاصل کرکے آنے والی پیڑھیوں کو متاثر کرسکے۔ ہر عہد، جس کی قدر و قیمت اور معنویت کو از سر نو تلاش کرے۔ اور پھر جس کے گھنے سایے تلے نئے تخلیقی پودے نمو پاکر برگ وبار لائیں۔ جزوی فرق کے ساتھ کم وبیش ادب عالیہ کا یہی مفہوم اردو میں رائج رہا ہے۔

یہ موقع نہیں ہے کہ ان ادبی اصطلاحوں کی سیاست یا اس بحث کی موشگافیوں میں الجھا جائے۔ اپنے مقصد کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم ادب عالیہ کے اسی تصور کو ذہن میں رکھیں اور اس کی تلاش وتعبیر میں تھوڑی سی لچک کو بھی گوارا کریں۔

مونوگراف تیار کرانے کی تحریک کیوں کر ہوئی؟ اور اس کتابی سلسلے کا مدعا کیا ہے؟ اس حقیقت سے اہلِ نظر آشنا ہیں کہ ادبِ عالیہ ہی نہیں، معاصر ادب کے مطالعہ کا ذوق و شوق بھی اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ عام پبلشر ہی نہیں بڑے سرکاری ادارے بھی جو اعلیٰ معیار کی کتب شائع کرتے ہیں ان کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اردو کا عام قاری ان کو خرید لے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ اگر وہ کلاسیکی ادب کے شاہکاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے تو اسے اکثر ضخیم دیوانوں یا نثری کتب کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ آج کے مصروف انسان کے پاس اتنی فراغت اب کہاں ہے کہ وہ ضخیم دفتر پڑھے۔ یہی حال طلبا کی ضرورتوں اور نصابی کتب کی دشواریوں کا ہے۔ باشعور اور خوش ذوق طلبا ادبِ عالیہ کے مطالعہ کا شوق اور جذبہ ضرور رکھتے ہیں لیکن وہ بھی ضخیم اور قیمتی کتابوں سے استفادہ کی ہمت نہیں کر پاتے۔ انھیں معیاری، مستند اور ارزاں کتابوں کی طلب ہوتی ہے۔ اس لیے اردو اکادمی کی اشاعتی کمیٹی نے حال ہی میں ہر پہلو سے غور کر کے یہ طے کیا کہ قدیم عہد کے ادبِ عالیہ کے نمائندہ ادیبوں اور شاعروں پر علمی انداز کے مونوگراف تیار کرائے جائیں۔ دہلی میں ایسے ناقدین اور کلاسیکی ادب کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو حسن و خوبی کے ساتھ یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ اشاعتی کمیٹی کی سفارش پر ہم نے ایسے عالموں کی ایک فہرست مرتب کر لی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کمیٹی نے ان اکابر قلم کاروں کی ایک فہرست بھی تیار کی ہے جن کے بارے میں پہلے دور میں مونوگراف تیار کیے جا رہے ہیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:

شعراء: فائز دہلوی، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر سوز، قائم چاندپوری، شیخ ابراہیم ذوق، میر اثر، مرزا غالب، مومن خاں مومن، نجم الدین مبارک آبرو، شیخ ظہور الدین حاتم، بہادر شاہ ظفر، داغ دہلوی۔

نثر نگار: شاہ عالم ثانی، میر امن، مرزا غالب، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ، میر ناصر علی دہلوی، علامہ راشد الخیری۔

یہ فہرست حتمی یا مکمل نہیں ہے۔ اشاعتی کمیٹی اس میں ترمیم و توسیع کرتی رہے گی۔

ہم نے اہلِ قلم حضرات سے گزارش کی ہے کہ وہ سادہ و شگفتہ اسلوب میں مونوگراف تیار کریں۔ صفحات کی تعداد ۱۱۲ سے ۱۲۸ تک ہو تا کہ یکسانیت رہے۔ اس کا دو تہائی حصہ مونوگراف پر مشتمل ہو۔ یعنی مصنف یا شاعر کی زندگی کے مستند حالات۔ تصانیف اور تصنیفی زندگی کے محرکات۔ اس کی نگارشات کی نمایاں اور منفرد خصوصیات اور دوسری اہم معلومات مونوگراف کا حصہ ہوں۔ اس کے بعد ایک تہائی یا اس سے کچھ کم صفحات میں اس کی تخلیقات کا ایک جامع انتخاب شامل ہو۔

یہ بات ایک حد تک طمانینت کا باعث ہے کہ جن ناقدین نے مونوگراف لکھنے کی ذمہ داری قبول کی انھوں نے اشاعتی کمیٹی کی ہدایات کو امکانی حد تک مانا اور پھر ان پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ البتہ دہلی کے چند ممتاز ادیبوں نے خرابیِ صحت یا کسی دوسری مجبوری کے باعث معذرت کر لی۔

اگر یہ سلسلہ پسند کیا گیا اور اس کی افادیت کو مانا گیا تو نہ صرف اسے جاری رکھا جائے گا بلکہ اسے زیادہ بہتر، دیدہ زیب اور موثر بنایا جائے گا۔

پروفیسر قمر رئیس

وائس چیئرمین اردو اکادمی

سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت اب بھی محسوس کی جاتی ہے۔ پیش نظر کتاب اسی ضرورت کے تحت لکھی گئی ہے۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات (1707ء) سے لے کر میر تقی میر کی وفات (1810ء) تک کا زمانہ، ہندوستان کی تاریخ کا سب سے پُر آشوب زمانہ ہے۔ مغل سلطنت کے قصر بلند کے ستون اور بام و در جس تیزی کے ساتھ اس دَور میں زمیں بوس ہوئے، مورخین نے اُن کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس عہد میں میر کے عازم لکھنؤ ہونے تک، ایک دو نہیں آٹھ کمزور اور نا اہل بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے یا بٹھائے گئے۔ ان کی کمزوری اور بے صلاحیتی سے فائدہ اُٹھا کر کبھی نادرشاہ دُرّانی نے دہلی میں قتل عام کیا اور ہزاروں اونٹوں، ہاتھیوں اور گھوڑوں پر کروڑوں کی دولت دہلی سے لوٹ کر لے گیا جس میں کوہ نور ہیرا اور تختِ طاؤس بھی شامل تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے تابڑ توڑ کئی مرتبہ لشکر کشی کر کے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ کبھی مرہٹوں نے اسے تباہ کیا تو کبھی سکھوں نے، کبھی روہیلوں نے اس کے باشندوں کو لوٹ کر قلاش کیا تو کبھی امرائے سلطنت کی خانہ جنگیوں نے اور کبھی جاٹوں نے اس کی انتہائی خوشحالی کو افلاس کی پستیوں میں دھکیلا اور کبھی سلطنت مغلیہ اور دہلی کے انحطاط و زوال کے تابوت میں آخری کیل برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جڑی۔ میر تقی میر نے اس تباہی و بربادی اور مغل سلطنت کے عبرت ناک زوال کو بہت قریب سے دیکھا اور وہ خود بھی دہلی کی طرح بار بار لٹتے رہے، دکھ جھیلتے رہے، بیروزگار ہوتے رہے اور اس عہد کے المیے کو اپنے رگ و ریشے میں پیوست کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر کی غزلیں دراصل دل اور دلی کے مرثیے ہیں۔ بے شک کلامِ میر میں اٹھارویں صدی کے شمالی ہند کی زوال آمادہ تہذیب اور مٹتی ہوئی ثقافت کی واضح تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس اعتبار سے میر کی شاعری کئی گنا زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے کہ اس میں ادبی خوبیوں اور شعری محاسن کے پہلو بہ پہلو اُن کا عہد بھی سانسیں لیتا ہے۔

آئندہ صفحات میں، میں نے کوشش کی ہے کہ رنگ آمیزی اور عبارت آرائی سے بچ کر میر کے زمانے کی سیاسی اور سماجی اتھل پتھل کا منظر پڑھنے والے کے سامنے آجائے، میر کی زندگی کے اہم واقعات معروضی انداز میں بیان کر دیے جائیں، ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل

میں جن عناصر کی کارفرمائی رہی ہے وہ روشنی میں آجائیں اور میرؔ کی سیرت کے بنیادی نقوش نیز ان کے کردار کی خوبیاں اور خامیاں اُجاگر ہو جائیں۔ میرؔ کی شاعری ایک ایسا وسیع موضوع ہے کہ اس پہ کئی کتابیں ناکافی ہوں گی، بہرنوع میں نے کوشش کی ہے کہ امتیازاتِ کلامِ میرؔ کچھ ایسے سیدھے سادہ انداز میں قلمبند ہو جائیں جنھیں قاری دلچسپی کے ساتھ پڑھ بھی سکے اور سمجھ بھی سکے اس غرض سے اشعار کی مثالیں اور حوالے بھی زیادہ درج کیے گئے ہیں۔ البتہ میں نے کتاب کو تحقیقی موشگافیوں اور خشک حواشی وغیرہ سے گرانبار نہیں ہونے دیا تاکہ ایک عام پڑھنے والے کو بیزاری یا بوجھل پن کا احساس نہ ہو۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ میرؔ کے منتخب کلام پر مشتمل ہے۔ انتخاب کا معاملہ بھی بڑا پیچیدہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کی پسند اور ناپسند دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ میں نے حتی الامکان سعی کی ہے کہ میرؔ کی غزلوں کے کم و بیش دس فیصد حصے کو اس انتخاب میں جگہ مل جائے اور اُن کے نمائندہ کلام سے عام قاری کی روشناسی ہو جائے، البتہ منتخب غزلوں سے بھی تکرار و اعادہ کی حیثیت رکھنے والے اشعار اور معمولی ابیات کو خارج کر دیا ہے تاکہ مختصر اور محدود صفحات میں میرؔ کے اچھے کلام کے لیے زیادہ گنجائش نکل سکے۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوں دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر قمر رئیس کا کہ انھوں نے اس کام کے لیے مجھے حکم دیا۔ اُن کی فرمائش کے مطابق یہ کام تین ہفتے میں مکمل کرنا لازمی تھا اور اس اثناء میں مجھے بیماریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ بقول میرؔ:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

میرا بیٹا فیروزؔ مظفر ایسے کاموں میں ہمیشہ معاونت کے لیے کمربستہ رہتا ہے اُس کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا کرے میری یہ کاوش آپ کو پسند آئے۔

مظفر حنفی

سیاسی اور سماجی حالات

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
(میرؔ)

مورخین اس نکتے پر متفق الرائے ہیں کہ ہندوستان میں مغل سلطنت کا شباب شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے ڈھلنے لگا۔ عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی جانشینی کے لیے جنگ شروع ہوگئی اور خاصی خوں ریزی کے بعد اس کا بڑا بیٹا معظم سریرِ حکومت پر متمکن ہوا اور بہادر شاہ کے لقب سے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی لیکن وہ محض چار برس تک ہی حکومت کر سکا اور 1712ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اب اس کے بیٹے تخت نشینی کے لیے باہم نبرد آزما ہوگئے حتیٰ کہ مرحوم بادشاہ کی میت مہینے بھر تک بے گوروکفن پڑی رہی۔ آخر بڑے خون خرابے سے گزر کر جہاں دار شاہ کو دہلی کی بادشاہت نصیب ہوئی۔ اُس کی عیاشیوں، بد اطواریوں اور مبتذل عادتوں نے مغل بادشاہوں کے شاہانہ وقار، تمکنت اور اولوالعزمی کو بُری طرح داغ دار کردیا۔ عوام میں اُس کی، لال کنور کے ساتھ رات دن عیاشیوں کے قصے مشہور تھے۔ شُہدوں اور کمینہ خصلت لوگوں کی صحبت اختیار کر کے اُس نے بہتیرے شرفاء، امراء اور معززین کو سرِ دربار بے عزت کیا۔ نتیجتاً سارا نظامِ سلطنت چرمرا گیا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق رعایا نے بھی بادشاہ کے مبتذل طور طریقوں کی بڑھ چڑھ کر تقلید کی اور تمام معاشرے میں سطحیت اور بدخصالی عام ہوگئی۔ ایک سال کے اندر ہی جہاں دار شاہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا اور سادات بارہہ نے اُسے تہہِ تیغ کر کے فرخ سیر کو تختِ شاہی پر متمکن کیا۔ یہ بادشاہ بھی متلوّن مزاج اور بدکردار ثابت ہوا۔ بے صلاحیتی اور امورِ سلطنت سے عدم واقفیت کی وجہ سے وہ اپنے امیروں اور درباریوں کے ہاتھوں میں تقریباً چھ برس تک کٹھ پُتلی کی طرح ناچتا رہا۔ اس کے دورِ حکومت میں ایک تاریخ ساز واقعہ ایسا رونما ہوا جس نے کچھ ہی دہائیوں میں ہندوستان کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ 1715ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک وفد فرخ سیر کے دربار میں حاضر ہوا اور مملکتِ ہند میں تجارت کے لیے مراعات مرحمت کرنے کی درخواست کی۔ ان دنوں بادشاہ فرّخ سیر بسترِ علالت پر تھا۔ انگریزوں کے وفد میں شامل ولیم ہیملٹن کے علاج سے فرّخ سیر کو صحت نصیب ہوئی اور دور اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر اس نے بطور انعام ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کی مطلوبہ مراعات تفویض کردیں جن کے مطابق کمپنی کو محصول کی ادائیگی کے بعد صوبہ بنگالہ میں تجارتی

سرگرمیاں جاری کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آگیا۔ کمپنی کو موجودہ کلکتہ کے قرب و جوار میں کوٹھیاں تعمیر کرنے کے لیے زمین بھی فراہم کر دی گئی۔ صوبہ دکن (حیدر آباد) میں بھی انگریزوں کو ایسی ہی مراعات سے نوازا گیا۔ مدراس اور سورت میں بھی بہت سی تجارتی سہولتیں عطا کر دی گئیں نیز ایسٹ انڈیا کمپنی کے جاری کردہ سکّے کو مغل سلطنت کی منظوری بھی مل گئی۔ فرخ سیر جب تک ساداتِ بارہہ کی مرضی کے مطابق حکومت چلاتا رہا وہ خوش رہے لیکن جب اُن کی ریشہ دوانیوں سے نجات پانے کے لیے اُس نے سادات بارہہ کے خلاف محاذ تیار کرنے کی کوشش کی تو اُسے گرفتار کرکے آنکھیں پھوڑ دی گئیں اور بالآخر ذلیل و رسوا کرکے 1719ء میں اُسے تہہِ تیغ کر دیا گیا۔

سادات بارہہ نے اب پھر شاہِ شطرنج کی طرح رفیع الدرجات کو اپنی بساط سیاست پر آگے بڑھا کر اُس تختِ طاؤس پر رونق افروز کیا جس پر کبھی شاہجہاں جیسا عظیم المرتبت شہنشاہ جلوہ گر ہوتا تھا۔ اس بادشاہ کو تپ دق کا عارضہ لاحق تھا اور لاغری نے اُسے کسی کام کا نہ رکھا تھا۔ انجام کار دو مہینے کی مختصر سی مدّت کے بعد ہی اُسے معزول کرکے اُس کے برادرِ بزرگ رفیع الدولہ کو تخت نشین کیا گیا جس کا خطاب شاہجہاں ثانی قرار پایا۔ اسے افیون کی لت نے بیمار بنا دیا تھا اور وہ صرف تین مہینے حکومت کرکے اس جہانِ فانی سے ملکِ عدم کو سدھار گیا۔ اب جہاں دار شاہ کے بیٹے روشن اختر کو محمد شاہ کے خطاب سے تختِ شاہی پر سجا دیا گیا۔ یہ بادشاہ اپنی رنگین مزاجی اور تعیش پسندی کی وجہ سے عوام الناس میں محمد شاہ رنگیلا کہا جاتا تھا۔ اس نے 1748ء تک حکومت کی اور اپنی عیاشیوں، ناعاقبت اندیشی اور فضول خرچیوں کے ہاتھوں شاہی خزانے کو کھوکھلا کر دیا۔ اس کے دَورِ حکومت میں مغل سلطنت کی چُولیں ہل گئیں اور یہ وسیع مملکت مسلسل سکڑتی رہی کیونکہ ہندوستان میں ہر طرف صوبہ داروں نے بغاوتوں کے پرچم بلند کر رکھے تھے اور خود مختار ہو رہے تھے اور بادشاہ تھا کہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر رنگ رلیاں مناتا رہا۔ انہیں وجوہ سے بعض مورّخ محمد شاہ کو عہدِ مغلیہ کا خاتم السلاطین کہتے ہیں۔

تاریخیں کہتی ہیں کہ محمد شاہ کے زمانے میں سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی کا دور دورہ تھا۔ شرفاء بطور خاص افلاس کا شکار تھے۔ دارالسلطنت میں درباری امراء اور منصب داروں کی ریشہ دوانیاں اپنے عروج پر تھیں اور اُن کے باہمی اختلافات، خودغرضیوں اور ریشہ دوانیوں نے خانہ جنگی اور باغیانہ شورشوں کو ہوا دے رکھی تھی جس کے ساتھ مرہٹوں کی لوٹ مار، چوتھ کے مطالبے اور بیرونی حملہ آوروں کی تاخت و تاراج نے خاص و عام سبھی کی زندگیوں کو ضیق میں ڈال دیا تھا۔ معاشی مسائل اور بے روزگاری عام ہوگئی اس لیے بیرونی حملہ آوروں کو یلغار کے لیے راستہ صاف ملتا رہا۔ برہان الملک سعادت خاں کی دعوت پر محمد شاہ رنگیلے کی حکمرانی کے دوران ہی 1739ء میں نادرشاہ درّانی نے دہلی پر حملہ کیا تھا اور یہاں اپنے 58 دن کے قیام کے دوران اسے تہس نہس کر دیا تھا نیز دہلی میں قتلِ عام کا حکم صادر کر کے تین دن تک مسلسل عوام و خواص کا خون بہا تا رہا تھا۔ ایک انگریز مورّخ کے بقول، کم و بیش ڈیڑھ لاکھ مرد و زن بلا امتیاز مذہب و ملّت تہہِ تیغ کر دیے گئے تھے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جب نادرشاہ نے نظام الملک سے معاہدہ کرلیا کہ محمد شاہ کی حکمرانی کو برقرار رکھے گا اور اس کے عوض محمد شاہ اُسے دو کروڑ روپیوں کا نذرانہ پیش کرے گا تو نظام الملک کے اقتدار کو زک پہنچانے کے لیے برہان الملک سعادت خاں نے نادرشاہ کو ورغلا دیا کہ یہ رقم بہت کم ہے دہلی کو لوٹ کر اس سے بیسیوں گنا زیادہ دولت حاصل کی جاسکتی ہے چنانچہ نادرشاہ نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور کوہِ نور ہیرے اور تختِ طاؤس سمیت ہندوستان کا شاہی خزانہ اور عوام و خواص کی بے پناہ دولت ہزاروں اونٹوں پر لاد کر اپنے ساتھ لے گیا نیز صوبۂ کابل اور دریائے سندھ کے مغرب کا سارا علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

1744ء میں محمد شاہ رنگیلے نے عمدۃ الملک کے مشورے پر نواب صفدر جنگ کو اودھ سے دہلی طلب کرلیا اور انھیں توپ خانے کا افسر مقرر کیا گیا۔ 1748ء میں محمد شاہ کے انتقال کے بعد صفدر جنگ اور اُس کے پیروکاروں نے دہلی کی عنانِ حکومت شاہ عالم ثانی (احمد شاہ) کے سپرد کر دی اور احمد شاہ نے صفدر جنگ کو وزیر مملکت مقرر کیا لیکن 1750ء میں صفدر جنگ

کولڑائی میں پٹھانوں کے ہاتھ زک اٹھانی پڑی تو احمد شاہ اس سے بدظن ہوگیا۔ کسی طرح صلح صفائی ہوئی لیکن چند برسوں میں ہی کدورت اور بڑھ گئی اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ 1753ء میں بادشاہ اور وزیر کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور تقریباً چھ مہینوں تک دہلی خود اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں شکست وریخت اور تاخت و تاراج سے دوچار رہی آخرش 1754ء میں شاہ دفرزین میں مصالحت ہوئی اور صفدر جنگ اودھ واپس چلے گئے۔ اس کے کچھ مہینوں بعد ہی وہی عماد الملک جو بادشاہ کے حق میں صفدر جنگ سے لوہا لے رہا تھا، سازش کر کے ہولکر سے مل گیا اور احمد شاہ کو معزول کر کے اُسے اور اس کی ماں کو اندھا کر دیا اور جہاں دار شاہ کے بڑے بیٹے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کا خطاب دے کر مسندِ شاہی پر متمکن کر دیا گیا۔ اس دوران میں سکھ، روہیلے اور جاٹ مسلسل شورشیں کرتے اور سلطنت کی بنیادیں ہلاتے رہے۔

1757ء میں انگریزوں نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو پلاسی کی جنگ میں شکست دی اور وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کا آغاز کر دیا۔ 1759ء میں عماد الملک نے فریب دے کر عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا اس وقت عالی گہر نے، جو بہار میں تھا اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ادھر دلّی میں عماد الملک نے محی السنّت کو شاہجہاں کا خطاب دے کر تختِ شاہی پر فائز کر دیا لیکن احمد شاہ ابدالی نے 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں فتح یاب ہو کر شاہ عالم ثانی کو دوبارہ ہندوستان کا بادشاہ مشتہر کر دیا۔ ابدالی نے ہندوستان پر بار بار حملے کیے اور یہاں کا شاہی خزانہ اور عوام و خواص کی دولت متعدد بار لوٹ کر اپنے وطن لے گیا۔ 1764ء میں شجاع الدولہ نے بکسر کے میدان میں بادشاہ کی جانب سے انگریزوں سے معرکہ آرائی کی اور شکست کا منہ دیکھا۔ انگریزوں نے شاہ عالم ثانی کو بہ ظاہر اپنی حفاظت میں لے لیا اور ایک برس کے اندر ہی اُس سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند حاصل کر لی۔ اب اس کٹھ پتلی بادشاہ کو دہلی چھوڑ کر الہ آباد میں قیام کے لیے مجبور کیا گیا۔ مزید برآں انگریزوں نے پچاس لاکھ روپیوں کے عوض اودھ کا علاقہ شجاع الدولہ کے سپرد کر دیا جہاں سے 1774ء میں شجاع الدولہ نے روہیلہ سردار رحمت خاں پر لشکر کشی کر دی اور انگریزوں کی مدد سے اُسے

جنگ میں شکست دے کر ہلاک کردیا۔ 1799ء میں انگریزوں نے سلطنت خدا داد میسور کے شیر دل حکمراں ٹیپو سلطان کو شکست دے کر اپنے اقتدار کی راہ کا کوہِ گراں ہٹا دیا۔ 1800ء میں نانا فرنویس کی وفات کے بعد مراٹھا اقتدار بھی ختم ہوگیا اور انگریز ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت بن کر سامنے آئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نابینا اور مجبور محض مغل تاجدار شاہ عالم ثانی کو پہلے ہی اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اب اس کا معمولی وظیفہ مقرر کردیا اور ہندوستان میں اپنی حکمرانی مستحکم کرلی۔ اب ہندوستان کے اندھے مغل بادشاہ کے بارے میں مشہور ہوگیا سلطنتِ شاہ عالم: از دہلی تا پالم۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں جو کچھ ہندوستان، خصوصاً دہلی پر گزری اُسے ملحوظ رکھ کر آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نادر شاہ کی لوٹ کھسوٹ، احمد شاہ ابدالی کے لشکر کی بار بار کی یلغار اور تاخت و تاراج، مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں، سکھوں اور سب سے بڑھ کر انگریزوں کے ہاتھوں دہلی کا بار بار لٹنا اور اندرونی خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ خود دلّی دربار کے امراء اور منصب داروں کی بدولت اس بدنصیب شہر کی ابتری کس نوبت کو پہنچی ہوگی اور دہلی بار بار تباہی و بربادی کے کیسے کیسے اندوہناک اور قیامت خیز مرحلوں سے دوچار ہوئی ہوگی۔ میرؔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد ایک دن میں ٹہلنے نکلا اور شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا۔ ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھا حیرت بڑھتی گئی۔ مکانوں کو شناخت نہ کرسکا، کسی عمارت کا پتہ تھا نہ عمارت کے آثار، نہ اُن کے مکینوں کی خبر ...... گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ، خانقاہیں صوفیوں سے خالی، خرابات رندوں سے، یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ لق و دق ...... نہ وہ بازار تھے جن کا بیان کروں ...... بڑے بڑے عالیشان محل خراب، گلیاں معدوم ہوگئیں ہر طرف وحشت برس رہی تھی۔'' (ذکرِ میرؔ: فارسی سے ترجمہ)

ان دردناک حالات اور بدامنی کے نتیجے میں اس عہد کی معاشرت بُری طرح متاثر ہوئی اور افراد میں بے کرداری عام ہوگئی نیز زندگی کا توازن متزلزل ہوگیا۔ بار بار کی شکست خوردگی نے حکمراں طبقے میں بے ہمتی اور قنوطیت پیدا کردی، قوتِ ارادی کو کمزور کیا نیز قوتِ عملی کو مفلوج کیا۔ گروہ بندی، مفاد پرستی اور تنگ نظری کو بڑھاوا ملا۔ ذہنوں میں سازشیں پروان چڑھنے لگیں اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی روش عام ہوگئی۔ حُبّ الوطنی اور ایثار پیشگی کا فقدان ہوگیا اس کی جگہ مصلحت بینی اور وقتی مفادات کو اہم سمجھا جانے لگا۔ دربار میں جلیل القدر سلاطینِ مغلیہ کے عہد میں رائج ڈسپلن اور نظم و نسق ناپید ہوگیا، سیاسی بصیرت اور تحمل عنقا ہوگئے۔ ایک طرح کی عدم اعتماد اور بے یقینی کی فضا نے ہر جگہ اپنا اثر جمالیا، شہدوں اور اُٹھائی گیروں نے معززینِ شہر اور اشرافیہ کی زندگی دوبھر کردی، جانبازوں کی جگہ بانکوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ عوام و خواص میں اخلاق کی پستی اور بدکرداری نے گھر کرلیا۔ فرض شناسی عنقا ہوگئی۔ خدا کی وحدانیت کا دم بھرنے والوں میں اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی کا دور دورہ ہوگیا۔ معاشرے میں ریاکار پیروں فقیروں اور فریبی 'اللہ والوں' کی باڑھ سی آگئی، نذر و نیاز کا چلن بڑھ گیا، جہالت، بے روزگاری، افلاس و نکبت نے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔ خوف اور دہشت کے ماحول میں زندگی بسر کرنے والے عوام و خواص کا مستقبل پر سے بھروسا اور خیر کی شر پر فتح سے ایمان اُٹھ گیا۔ وسیع المشربی اور روا داریوں کا چلن نہیں رہا۔ وضعداریاں اور بھائی چارگی وغیرہ قصۂ پارینہ بن گئے۔ سچی وفاداری اور بے لوث دوستی کو لوگ حماقت سے تعبیر کرنے لگے۔ تملق شعاری اور خوشامد کا چلن عام ہوا۔ آرام پسندی، دولت کی ہوس اور جاہ پرستی، معاشرے سے جونک کی طرح لپٹ گئے۔ نظم و نسق کے فقدان کی وجہ سے روز نت نئے فتنے سر اُٹھانے لگے۔ طاقتور کو کمزوروں پر زیادتی کرنے اور دولت مندوں کو غریبوں کا خون چوسنے سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ فراغت نصیب لوگوں میں امرد پرستی، شراب نوشی اور سطحی تفریح کے رجحانات پیدا ہوگئے، چالاک اور فتنہ پرداز لوگ ہنرمندوں کا استحصال کرنے لگے، صناعوں، تخلیق کاروں اور عالموں کی اس سماج میں کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی۔ زندگی بے مقصد اور حکومت بے جہت ہوگئی۔ ملک بھر میں بے لگام جاگیرداروں، منصب

داروں اور اہلکاروں نے ایسی لوٹ کھسوٹ مچائی کہ بے کس و لاچار عوام کی زندگی اجیرن ہوگئی، کسان کی حالت غلام سے بدتر ہوگئی اور بیزاری سے جوتی جانے والی زمینیں بنجر ہونے لگیں کیونکہ اس نظام میں کسان کو جب چاہے بے دریغ زمین سے بے دخل کیا سکتا تھا۔ زیادہ تر کسانوں نے زراعت کے بجائے مزدوری کو سُود مند سمجھا اور دیہات سے شہر کا رُخ کیا۔ شاہِ شطرنج جیسے بے طاقت بادشاہ کے فرمان پر لوگوں نے کان دھرنا چھوڑ دیا۔ رشوت خوری اور سفارش کا ایسا زور ہوا کہ تمام قوانین بے اثر ہو کر رہ گئے۔ بے اصولی اور بدعنوانی سکّۂ رائج الوقت ہوگئے۔ حال سے بے اطمینانی نے لوگوں کو مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا۔

ایسے عالم میں تباہ حال دہلی سے اہلِ حرفہ، اہلِ قلم، اربابِ نشاط اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ بڑی تعداد میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور علاقوں میں جا بسے۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد لکھنؤ منتقل ہونے والوں کی تھی جو فیض آباد کے بعد صوبہ اودھ کا دارالخلافہ قرار پایا تھا اور ایک نوع کی عارضی خوشحالی کا حامل تھا لیکن اس مصنوعی خوشحالی کی، لکھنؤ کے نواب وزیر آصف الدولہ کو بڑی قیمت چکانی پڑی تھی۔ نواب وزیر آصف الدولہ کو اودھ کی حکمرانی حاصل کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بددیانت اور شقی القلب وارن ہیسٹنگز کے فرمان پر سرِ تسلیم خم کرنا پڑا تھا اور اس نے اپنی حقیقی ماں، دادی اور مرحوم باپ شجاع الدولہ کے حرم کی دیگر خواتین پر انگریزوں کے مطلوبہ تودۂ زر کی فراہمی کے لیے ایسے ناروا مظالم روا رکھے جن کے تصور سے انسانیت کانپ اُٹھتی۔ ہے اُس نے انگریزی فوج کی مدد سے بیگمات کے زیورات اور اثاثہ لوٹ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تقاضہ پورا کیا۔

لکھنؤ کی مبیّنہ خوشحالی کو عالمِ نزع میں مبتلا بیمار کے سنبھالے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ''بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے۔'' یہاں میں اپنی ایک کتاب کا اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

> ''درحقیقت دہلی کی مرکزی حکومت کی گرفت دور دراز کے علاقوں اور صوبے داروں پر کمزور پڑ رہی تھی جس میں شاہدِ خوبیِ تقدیر کے ساتھ ایسٹ

انڈیا کمپنی کی کارفرمائیاں بھی شامل تھیں۔ کچھ یہ بھی تھا کہ صفدر جنگ اور مغل بادشاہ کے درمیان ناچاقی نے وزیر کے جذبۂ وفاداری کو کچھ ماند کردیا اور اس کا اثر آئندہ نسلوں پر بھی پڑا۔ پھر اودھ کے حکمرانوں نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور دُور اندیشی کے وسیلے سے ہندوستان کے آئندہ نظامِ معیشت کا اندازہ بھی کیا ہوگا۔ بہرحال ان تمام باتوں کے مجموعی اثرات کے تحت والیان اودھ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا اور وزیر کے بجائے نواب کہے جانے لگے۔ حالات کا جائزہ لے کر انھوں نے خود مناسب سمجھا یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدیداروں نے انھیں مجبور کیا، کہا نہیں جاسکتا، لیکن یہ ضرور تھا کہ نوابینِ اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین وقتاً فوقتاً جو معاہدے ہوئے اُن کے مطابق جہانبانی کے اساسی فرائض، مثلاً سرحدوں کی حفاظت، افواج کی تربیت اور تقرری نیز نظم ونسق کی بیشتر ذمہ داریاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کردی گئیں، جس کا معاوضہ ظاہر ہے، انگریزوں نے دوسرے طریقوں سے وصول کیا۔ ان حالات میں سلطنت اودھ ایک عجیب قسم کی دوعملی کیفیت سے دوچار ہوئی۔ جس میں رنج ومسرت دونوں آمیز تھے۔ ہرچند کہ نوابینِ اودھ نے مغل بادشاہ سے یکسر بیزاری کا اعلان نہیں کیا اور ظاہراً اس کے وفادار رہے جیسا کہ مرزا سلیمان شکوہ کے ساتھ نوابین اودھ کے احترام آمیز سلوک اور انھیں ملنے والے گرانقدر وظیفے سے ظاہر ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اودھ سے دہلی کے خزانے کو ادائیگی بند ہوگئی تھی اور خود والیِ اودھ کو فوج اور نظم ونسق کے دوسرے اخراجات برداشت کرنے سے نجات مل چکی تھی اس لیے خزانہ لبریز تھا دوسری طرف نوابینِ اودھ اتنے سادہ لُوح بھی نہ تھے کہ ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی انگریزی ریشہ دوانیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عیار عہدیداروں کی چالوں سے واقف نہ ہوں۔ دوسرے والیانِ ریاست کی طرح وہ بھی اس بڑھتی ہوئی آندھی کو روکنے کی سکت نہیں رکھتے

تھے اور جانتے تھے کہ جلد یا بدیر انھیں، مغل بادشاہ کو اور دیگر ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنی اپنی سلطنتیں انگریزی کمپنی کے حوالے کرنی ہوں گی۔ بصورت دیگر انھیں احساس تھا کہ جو بھرا پُرا خزانہ اس وقت اُن کی تحویل میں ہے، کسی وقت بھی اُن سے چھن سکتا ہے۔ ان حالات میں ہر آنے والے نواب نے فطری طور پر یہی چاہا کہ اپنے دَور میں زیادہ سے زیادہ دولت خرچ کر کے ذاتی عیش و عشرت کے ساتھ اپنی بقائے دوام اور نام و نمود کی صورت نکالی جائے اور اسی صورتِ حال نے انھیں داد و دہش کی طرف مائل کیا جس کے نتیجے میں ملک بھر، خصوصاً دہلی سے جو بار بار لُٹ کر قلاش ہو رہی تھی، مختلف علوم و فنون کے ماہرین، صنّاع، معمار، زرگر، زرباف، سپہ گر، شاعر، ادیب، رقّاص، مصوّر، موسیقار اور اربابِ نشاط، الغرض ہر شعبۂ حیات کے چنندہ افراد اودھ کی طرف کھنچنے لگے جہاں انھوں نے نوابینِ اودھ کی انفرادیت پسندی کو آسودہ کرنے کے لیے ہر فن اور ہر ہنر میں نئی نئی قلم کاریاں کیں۔" (غزلیاتِ میر حسنؔ: مظفر حنفی)

محولہ بالا اقتباس میں پیش کردہ حقائق اور صورتِ حال کے نتیجے میں لکھنؤ کی معاشرت اور تمدن، دہلی سے مختلف اور منفرد تھا۔ دہلی کی روایتی برتری نے والیانِ لکھنؤ کو احساس کمتری میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ہر چند کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں حکمرانِ اودھ کو بادشاہ تصوّر کر کے سکّہ بھی جاری کر دیا گیا تھا۔ آصف الدولہ کے زمانے میں ہی لکھنؤ کے صاحبانِ اقتدار کو دہلی پر سبقت لے جانے کا خیال پیدا ہوا جس کے پسِ پشت سیاسی ہزیمت اور انگریزی طاقت کے سامنے اپنی بے بضاعتی کا احساس کارفرما تھا، چنانچہ اپنے سیاسی تنزّل پر پردہ ڈالنے کے لیے نوابینِ اودھ نے مغلیہ سلطنت کے دارالخلافہ دہلی سے بڑھ چڑھ کر لکھنؤ کو عروس البلاد بنانے کا تہیہ کر لیا تاکہ شاہ دہلی کے بالمقابل اُن کا سیاسی اور تہذیبی تشخص اُبھرا ہوا نظر آئے۔ ان نوابین نے تمدن اور معاشرت کے مختلف شعبوں، رہن سہن،

ملبوسات، انداز گفتگو، رسومات، آداب مجلس اور تعظیم و تکریم کے طور طریق اور دیگر سماجی امور میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے لیے بے دریغ دولت لٹائی جس کے باعث اکثر تاریخ دانوں کو اس معاشرے میں ایک نوع کا ''نو دولتیا پن'' اور سطحیت جاری و ساری نظر آتی ہے۔ شاعری میں دہلی کی تصوف پسندی، امرد پرستی اور داخلیت کی جگہ خارجیت پسندی، طوائفیت اور محبوب مجازی کے جسمانی سراپا اور لباس و آرائش پر زور دیا گیا۔ زبان ولغت میں بھی انفرادیت اور اختلاف کے پہلو نکالے گئے اور قلعہ معلی کی ٹکسالی زبان کے مقابلے پر چمکدار نسائی اور بیگماتی زبان نے فروغ حاصل کیا۔ دہلی میں اولیاء اللہ کے مزارات پر قوالی کی محفلیں ہوتی تھیں اور عرس منائے جانے کی روایت تھی، لکھنؤ میں، اندر سجائیں سجائی جانے لگیں اور مرثیے کی مجالس منعقد ہونے لگیں۔ دہلی کی بے تکلفی کے مقام پر لکھنوی تکلف نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی۔ خلوص کی جگہ ہر شعبے میں بناوٹ اور تصنع کا رواج بڑھا، لباس میں سادگی کی جگہ تزک بھڑک اور شان وشوکت پر زور دیا جانے لگا۔ سیر و شکار اور بٹیر بازی جیسے کھیلوں اور شطرنج بازی سے عوام و خواص کا شغف جنون کی حیثیت اختیار کرگیا۔ حکمرانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے نظم ونسق کے جھمیلوں اور امور سلطنت کی فکروں سے آزاد کردیا تھا اس لیے بے مقصد لطیفے بازیوں اور زنانِ بازاری کے ساتھ خوش فعلیوں کے لیے دولت اور وقت کی کمی نہیں تھی، کوئی نواب زچگی کے ڈھونگ رچاتا تو کوئی کرشن کنہیا کا سوانگ بھرتا۔ نواب زادے اور رئیس زادے زبان، تہذیب اور آداب مجلس سیکھنے کے لیے طوائفوں کے بالا خانوں پر بھیجے جاتے، راتوں کو نیند لانے کے لیے طلسم ہوشربا جیسی داستانیں وجود میں آئیں۔ بھنگ، افیون اور شراب نوشی اب عیوب میں شامل نہیں رہ گئے تھے۔ دہلی میں صوفیوں کے مزارات مرجع خلائق تھے نوابین اودھ نے مرثیے اور ماتم کی مجلسوں کے لیے عظیم المرتبت امام باڑے تعمیر کرائے۔ الغرض دہلی کے برعکس لکھنؤ میں پُر تصنع اور نمائشی سہی لیکن ایک مختلف عیش وعشرت میں ڈوبی ہوئی زندگی تھی پھر بھی دہلی سے آنے والے شعراء میر، میر حسن، مصحفی، جرأت وغیرہ کو لکھنؤ زیادہ پسند نہیں آیا۔

سوانح حیات

خوش ہیں دیوانگی میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ
(میرؔ)

میرؔ کے جدِ اعلیٰ حجاز سے تلاشِ روزگار میں دکنی ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ ان کے خاندان کے کچھ لوگ کسی وقت اکبر آباد آ گئے جو اس زمانے کی مغل حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ میرؔ کے دادا اُسی خاندان سے تھے جنھیں فوج میں ملازمت مل گئی تھی۔ موصوف پچاس برس کی عمر میں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو جنون کا عارضہ لاحق تھا اور وہ جوانی میں ہی وفات پا گئے۔ چھوٹے بیٹے کا نام محمد علی تھا جو آگے چل کر اپنے زہد وتقویٰ کی بنا پر علی متقی کے خطاب سے موسوم ہوئے۔ انھوں نے علوم متداولہ کی تعلیم شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے حاصل کی۔ اُن کی پہلی زوجہ دہلی کے مشہور شاعر اور عالم، سراج الدین آرزوؔ کی بڑی بہن تھیں جن کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام حافظ محمد حسن تھا۔ دوسری بیوی سے علی متقی کے ہاں تین اولادیں ہوئیں، دولڑکے محمد تقی اور محمد رضی اور ایک بیٹی، جو بڑی ہو کر محمد حسین کلیم کو بیاہی گئیں۔ علی متقی کے بڑے بیٹے محمد تقی ہی اردو غزل کے عظیم شاعر میر تقی میرؔ ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش 20 ستمبر 1722ء ہے۔ شواہد بتاتے ہیں کہ میرؔ کی والدہ کا اُن کی کم سنی میں ہی انتقال ہوگیا لیکن اُن کی تاریخِ وفات پردۂ خفا میں ہے۔

میرؔ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''ذکرِ میرؔ'' میں اپنے والد کے بارے میں جو واقعات بیان کئے ہیں، وہ خاصے دلچسپ ہیں۔ بقول میرؔ، اُن کے والد علی متقی ایک مشہور خدارسیدہ بزرگ تھے جن سے مختلف اوقات میں کرامات بھی سرزد ہوئیں۔ موصوف جذب و کیف کے عالم میں ایک مرتبہ لاہور جا پہنچے اور وہاں درویشوں سے ملاقات کرکے واپسی میں کچھ عرصہ دہلی میں بھی قیام کیا، جہاں معتقدین کا ہجوم ان کے گرد و پیش لگا رہتا تھا۔ ان سے تنگ آ کر دہلی سے آگرہ کو روانہ ہوگئے۔ اثنائے راہ میں بیانہ کے ایک خوبرو سید زادے کو اُن سے اتنی عقیدت ہوگئی کہ کچھ دن بعد علی متقی کو ڈھونڈتے ہوئے وہ دہلی آ پہنچے اور پھر اُن کے ہمراہ رہنے لگے۔ ان حضرت کا نام امان اللہ تھا جو علی متقی کے مُرید ہوئے اور اُن کی تربیت اور نگاہِ کشف کی بدولت خود 'فقیر کامل' کے درجے کو پہنچے۔ درویش صفت علی متقی نے میرؔ کو

سات برس کی عمر میں تربیت کے لیے امان اللہ کے سپرد کردیا اور میر اُن سے قرآن شریف پڑھنے لگے۔ ابھی میر دس برس کے ہی ہوئے تھے کہ اُن سے بے حد محبت کرنے والے منہ بولے چچا امان اللہ ملکِ عدم کو سدھار گئے۔ میر کے والد کو اپنے عزیز از جان مرید کی دائمی جُدائی کا اتنا رنج ہوا کہ سال بھر کے اندر اندر ہی وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ 'ذکر میرؔ' کے مطابق علی متقی کی تاریخ وفات 18 ر دسمبر 1733ء ہے۔ میر اس وقت بمشکل گیارہ برس کے تھے۔ اس نوعمری میں ہی اُن کو اپنے علاوہ چھوٹے بھائی محمد رضی اور چھوٹی بہن کا پیٹ بھرنے کی فکر لاحق ہوگئی کیونکہ اُن کے سوتیلے بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے ان لوگوں سے قطع تعلق کر رکھا تھا اور باپ سے ترکے میں ملنے والی تقریباً تین سو کتابوں میں سے انھیں ایک بھی نہیں دی تھی۔ امان اللہ کا ایک مرید، مکمل خاں پانچ سو روپے کی ایک ہنڈی علی متقی کی وفات کے وقت لایا تھا جس سے اُن کی تجہیز و تکفین ممکن ہوسکی۔

اب میر آگرہ اور اس کے گردونواح میں روزگار تلاش کرنے لگے لیکن ناکامی ہاتھ آئی۔ مجبور ہو کر 1734ء میں وہ تلاشِ معاش کی غرض سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچ کر فکرِ روزگار نے انھیں بہت سرگرداں اور پریشان رکھا۔ کچھ مدت بعد ان کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوگئی جو اُن کی پریشاں حالی پر ترس کھا کر انھیں اپنے چچا صمصام الدولہ کی خدمت میں لے گئے۔ موصوف محمد علی متقی سے عقیدت رکھتے تھے، چنانچہ یہ کہہ کر کہ اُن کے مجھ پر حقوق ہیں، ایک روپیہ یومیہ وظیفہ میر تقی میر کا مقرر کردیا۔ اب میر دہلی سے واپس اکبر آباد آگئے اور اسی ایک روپیہ یومیہ پر اپنے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کے ساتھ گزر بسر کرنے لگے لیکن فلک کج رفتار نے جلد ہی یہ سہولت بھی میر سے چھین لی۔ میر کو ایک روپیہ روزانہ کی جو یافت بطور وظیفہ صمصام الدولہ کی بارگاہ سے ہو رہی تھی، وہ 1739ء میں منقطع ہوگئی کیونکہ وہ مہربان شخص، نادر شاہ سے جنگ میں زخمی ہوکر راہیِ ملک عدم ہوگیا اور اکبرآباد میں میر اپنے برادر خورد کے ساتھ ایک بار پھر بے یار و مددگار ہوگئے۔ بڑے بھائی کی مانند علی متقی کے تمام مرید اور عقیدت مند بھی اُن کے بے سہارا بیٹوں کی مدد کو سامنے نہیں آئے اور چار و ناچار میر نے دوبارہ دہلی کا رُخ کیا۔

اس بار دہلی میں محمد تقی نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے گھر میں قیام کیا۔ دہلی پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی میر جنون کے عارضے میں مبتلا ہو گئے جو ان کا خاندانی مرض تھا۔ اس سے نجات پانے میں ڈیڑھ سال لگے۔ سراج الدین علی خاں اپنے وقت کے جید عالم اور مشہور شاعر تھے۔ میر اگلے سات برسوں تک اُن کے ہاں مقیم رہے اور خور و نوش کے علاوہ ان کے زیر سایہ تعلیم و تربیت کے مراحل سے بھی گزرے لیکن کچھ ایسے حالات در پیش ہوئے کہ خان آرزو اُن کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنے لگے۔ میر نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انھیں حافظ محمد حسن نے میر کے خلاف ورغلایا تھا۔ الغرض خان آرزو کے دل شکن رویئے سے تنگ دل ہو کر میر نے اُن کے ہاں اقامت ترک کر دی اور حوض قاضی چلے گئے۔ وہاں علیم اللہ خاں اُن پر مہربان ہو کر رعایت خاں کے پاس لے گیا جو قمرالدین خاں وزیر کے بھانجے اور مالوہ کے صوبیدار کے بیٹے تھے نیز متمول و باثر آدمی تھے انھوں نے میر کو اپنا مصاحب مقرر کر لیا۔ اس طرح میر نے بیروزگاری سے نجات پائی۔ اس دَور کے تذکروں کے مطابق میر کی اردو شاعری کا آغاز خان آرزو کے ہاں رہائش کے دوران اور انھیں کی تحریک و تربیت کے زیر اثر ہوا لیکن بعد میں پیدا شدہ کبیدگی کے باعث میر نے کھل کر ان سے استفادے اور کسب فیض کرنے کا اعتراف نہیں کیا۔ قرائن کے مطابق میر کی شعر گوئی کی ابتداء 1740ء کے آس پاس ہوئی۔ خان آرزو کی صحبت و تربیت اور وہبی صلاحیت کے زیر اثر میر تقی میر نے بہت کم عرصے میں خاصی مشق بہم پہنچائی اور اپنے عہد کے مقامی شاعروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ ایک آدھ محقق کا خیال ہے کہ میر نے جعفر عظیم آبادی سے بھی درس لیا تھا اور شعر کہنے کی ترغیب انھیں سعادت امروہوی نے دلائی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، حالات نے میر کو رعایت خاں کا متوسل بنا دیا تھا یہ 1748ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ رعایت خاں کے ماموں وزیر قمرالدین خاں اس زمانے میں احمد شاہ ابدالی سے جنگ آزما تھے۔ رعایت خاں کے ساتھ میر بھی ان کے لشکر میں شامل تھے۔ قمرالدین لڑتے ہوئے سخت زخمی ہو گئے اور اس کے نتیجے میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اس

کے چند دنوں بعد بادشاہ وقت محمد شاہ رنگیلے بھی دنیا سے رخصت ہو گیا اور تخت شاہی پر احمد شاہ رونق افروز ہوا۔ اُس نے صفدر جنگ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اب رعایت خاں اُن کے ہمراہ دہلی منتقل ہو گئے اور انھیں کے ساتھ میرؔ بھی پھر دہلی پہنچ گئے۔ بادشاہ نے راجا بخت سنگھ کو اجمیر کا صوبیدار مقرر کر کے اُس کے بھائی کی سرکوبی کے لیے راجپوتانہ روانہ کیا تو وہ اپنے ساتھ رعایت خاں کو بھی لے گیا۔ میرؔ حسب سابق اس مرتبہ بھی رعایت خاں کے ہمراہ لشکر میں تھے۔ اس سفر میں میرؔ نے حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی۔ کچھ ناگزیر وجوہ سے جلد ہی رعایت خاں نے بخت سنگھ کی رفاقت ترک کر دی اور میرؔ کے ساتھ دہلی واپس آ گئے۔ اس کے بعد میرؔ زیادہ دنوں تک رعایت خاں کے ساتھ نہیں رہ سکے۔ ہُوا یہ کہ ایک دن رعایت خاں نے میرؔ سے فرمائش کی کہ وہ اپنے کچھ اشعار اُس کے ایک پسندیدہ میراثی زادے کو حفظ کرا دیں تاکہ وہ انہیں گا کر سُنا سکے۔ میرؔ کو یہ بات ناپسند ہوئی لیکن رعایت خاں نے اپنے سر کی قسم دی تو مجبور ہو کر حکم کی تعمیل تو کی لیکن ان کی نازک مزاجی نے وہاں زیادہ دن ٹھہرنے کی اجازت نہ دی اور میرؔ نے رعایت خاں کی مصاحبت 1749ء میں ترک کر دی۔ رعایت خاں کو بھی غالباً اپنی زیادتی کا احساس تھا اور میرؔ کی اعانت منظور تھی اس لیے اُس نے میرؔ کی جگہ اُن کے چھوٹے بھائی محمد رضی کو ملازم رکھ لیا۔

کچھ دنوں کے بعد میرؔ نے نواب بہادر جاوید خاں، خواجہ سرا کی ملازمت اختیار کی۔ یہ ایک طرح کی اعزازی نوکری تھی۔ میرؔ کو عام سپاہیوں کی طرح گھوڑا رکھنے اور کسی طرح کا کام کرنے سے معاف رکھا گیا تھا، محض تنخواہ وصول کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں میرؔ کو قدرے فراغت اور فرصت نصیب تھی اس لیے انھوں نے اسی اثناء میں اپنا تذکرۂ شعرائے اردو، تصنیف کیا جس کا نام ''نکات الشعراء'' ہے۔ ہر چند کہ اس تذکرے کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے بیشتر مندرجات سے میرؔ کے معاصرین کو تکلیف پہنچی اور اس کا منفی ردِعمل اس دَور کے کئی تذکرہ نگاروں کی تحریروں میں دیکھا گیا۔ میرؔ کا یہ دعویٰ اپنی جگہ درست ہے کہ ''نکات الشعراء'' اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے لیکن اُن کا

ولی دکنی کو شیطان سے زیادہ مشہور کہنا، دیگر ممتاز شاعروں کے کلام پر اصلاحیں دینا نیز سودا، خان آرزو، داؤ، فغاں، حاتم، یقین، محمد علی حشمت، تاباں، بندرابن راقم وغیرہ کے بارے میں اُن کے تضحیک آمیز بیانات نے دہلی میں میر کے خلاف ماحول کو گرم کر دیا اور اُن کی بد دماغی اور تکبر کے چرچے عام ہو گئے۔ صفدر جنگ نے جاوید خاں خواجہ سرا سے ناراض ہو کر اُسے قتل کرا دیا تو میر پھر بے روزگار ہو گئے۔ 1752ء تک میر کا قیام خان آرزو کے پڑوس میں تھا اب انھوں نے وہاں کی سکونت ترک کر دی اور امیر خاں انجام کی حویلی میں رہنے لگے۔ کچھ دنوں تک میر نے دیوان مہانرائن کے یہاں بھی نوکری کی۔ صفدر جنگ کو میر کی مشکلات کا اندازہ تھا۔ اُس نے اپنے داروغۂ دیوان خانہ، نجم الدین سلام کے ذریعے اُن کی اعانت کی اور پاس بلایا، چنانچہ میر کے کچھ اور دن فراغت میں گزر گئے۔ اکتوبر 1754ء میں صفدر جنگ کا انتقال ہو گیا اور میر تقی میر ایک مرتبہ پھر بے کار اور بے سہارا ہو گئے۔ اوائل 1756ء میں سابق وکیل بنگالہ راجا جگل کشور میر کو گھر سے بلا کر لے گئے اور اپنا کلام اصلاح کی غرض سے پیش کیا۔ میر کہتے ہیں کہ وہ چیزیں لائق اصلاح نہیں تھیں اس لیے زیادہ تر قلم زد کر دیں۔ جگل کشور کے وسیلے سے میر کی رسائی مہاراجہ ناگرمل تک ہوگئی جو نیابت وزارت پر نئے نئے فائز ہوئے تھے۔ انھوں نے ازراہِ التفات میر کو ملازم رکھ لیا۔ میر یہاں ایک برس تک ہی اطمینان اور سکون کے ساتھ رہنے پائے تھے کہ فلکِ کج رفتار نے پھر ان سے آنکھیں پھیر لیں اور احمد شاہ ابدالی نے پھر ایک مرتبہ دہلی پر یلغار کی اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس حادثے کے بارے میں 'ذکرِ میر' میں میر رقمطراز ہیں:

> ''میں کہ فقیر تھا اور فقیر ہو گیا۔ میرا حال بے اسبابی اور تہی دستی کی وجہ سے ابتر ہو گیا۔ شاہراہ پر جو میرا جھونپڑا تھا، مسمار ہو گیا۔''

اس افراتفری سے پریشان ہو کر میر اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر دہلی سے نکل گئے، آٹھ دس کوس طے کرنے کے بعد ایک درخت کے نیچے پریشان حال بیٹھے تھے کہ جگل کشور کی بیوی اُسی راستے سے گزری اور بے آسرا و بے سروسامان میر کو اپنے ہمراہ برسانہ

لے گئی۔ میرؔ وہاں سے کاماں ہوتے ہوئے کھمبیر پہنچے جہاں جاٹ راجا سورج مل کا ایک قلعہ تھا جسے راجا ناگرمل نے اپنی پناہ گاہ بنا رکھا تھا میرؔ نے کچھ دن ناگرمل کے زیر سایہ وہیں گزارنے کے بعد راجا سے رخصت کی اجازت چاہی تو ناگرمل نے کہا کہ میں آپ کو 'بیاباں مرگ' ہونے کا موقع نہیں دوں گا۔ میرؔ کو خرچ کے لیے کچھ زر مرحمت کیا گیا اور پہلے کی طرح وظیفہ جاری کرنے کا پروانہ عطا کیا۔ اس طرح میر تقی میرؔ اگلے تیرہ برس یعنی 1771ء تک ناگرمل کی خدمت میں رہے۔ اس مدت میں میرؔ، راجا ناگرمل کے ساتھ دہلی بھی گئے۔ وہاں احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں کو پانی پت میں شکست دے کر اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا۔ میرؔ نے اس کے ہاتھوں دہلی کی تاراجی اور تباہی کا دردناک نقشہ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں کھینچا ہے۔ احمد شاہ ابدالی دہلی کو تباہ و برباد کر کے واپس گیا تو سورج مل جاٹ نے آگرہ پر قبضہ کرلیا اور ناگرمل کو وہاں آنے کے لیے پرچہ بھیجا۔ وہاں جا کر ناگرمل نے راجا اور بادشاہ کے بیچ صلح کرادی۔ ان کے ساتھ میرؔ بھی آگرہ پہنچے، علی متقی اور امان اللہ کی قبروں پر فاتحہ پڑھی اور اکبر آبادی شاعروں سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ چار مہینے آگرہ میں رہ کر میرؔ کھمبیر کے قلعے میں لوٹ آئے۔

کبھی کبھار عماد الملک بھی سورج مل کے قلعوں میں آ کر مقیم ہوتے تھے، میرؔ کی وہاں اُن سے ملاقات ہوئی جس کا تذکرہ ''ذکرِ میرؔ'' میں آیا ہے۔

اسی زمانے میں حالات کی گردش سے مرہٹوں اور سورج مل کے بیٹوں میں ناچاقی ہوگئی اور دونوں کے لشکر ایک دوسرے کے مقابلے پر اُتر آئے۔ راجا ناگرمل مصلحتاً سورج مل کے قلعے سے نکل کر آگرہ چلے آئے۔ میرؔ حسبِ دستور اُن کے ہمراہ تھے۔ پندرہ دن بعد راجا ناگرمل نے کھمبیر آ کر جائزہ لیا تو حالات پُر آشوب تھے۔ انھوں نے تقریباً بیس ہزار اہالیانِ دہلی کو وہاں اپنی پناہ میں رکھ چھوڑا تھا۔ جاٹوں کی مرضی کے خلاف ان سب باشندگانِ دہلی کو ساتھ لے کر ناگرمل ایک دوسرے شہر، کاماں چلے گئے۔ میرؔ بھی اس قافلے میں تھے۔ 1771ء میں شاہ عالم، الہٰ آباد سے فرخ آباد آیا تو ناگرمل نے میرؔ کے سپرد یہ سفارت کی کہ

وہ حسام الدین سے مل کر، جو بادشاہ کے مزاج داں تھے، کچھ معاہدے کریں۔ میرؔ نے کوشش کی اور مقصد برآری ہاتھ آئی لیکن ناگرمل کو اُن کے چھوٹے بیٹے نے سمجھایا کہ بادشاہ کے بجائے معاملت مرہٹوں سے رکھنی چاہیے۔ راجا نے میرؔ کے معاہدے رد کر دیے۔ میر کو اپنے بے آبروئی کا شدید احساس ہوا، چنانچہ ناگرمل سے دہلی آ کر علیحدگی اختیار کر لی اور اُن کے بڑے بیٹے رائے بہادر سنگھ کے ساتھ ہو گئے جو بادشاہ دہلی کے حق میں تھا۔

1772ء میں بادشاہ کے حلیف مرہٹے اُسے لے کر دہلی آئے اور مجبور کیا کہ نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں پر چڑھائی کی جائے۔ سکرتال پر، جہاں ضابطہ خاں صف بند تھا، حملہ ہُوا، ضابطہ خاں بھاگ گیا اور مرہٹوں نے اُس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ حملہ آور شاہی لشکر میں ناگرمل کا بیٹا رائے بہادر سنگھ اور میر تقی میرؔ بھی شریک تھے۔ چونکہ مرہٹے سارا مال و اسباب لے گئے تھے اس لیے رائے بہادر سنگھ کی مالی حالت بھی خستہ ہوگئی اور میر تقی میرؔ تو کوڑیوں تک کے محتاج ہو گئے۔ وہ ''ذکرِ میرؔ'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں بھیک مانگنے کے لیے اُٹھا اور شاہی لشکر کے ہر سردار کے در پر گیا۔ چونکہ شاعری کی وجہ سے میری شہرت بہت تھی، لوگوں نے میرے حال پر خاطر خواہ توجہ کی۔ کچھ دنوں تنگی کی سی زندگی گزاری۔ آخر کار حسام الدولہ کے چھوٹے بھائی وجیہ الدین خاں سے ملا۔ اُس نے میری شہرت اور اپنی اہلیت کے مطابق تھوڑی مدد کی اور بہت تسلی دی۔''

دہلی میں سخت تنگدستی کی وجہ سے میرؔ گوشہ نشین سے ہو گئے۔ اب دوسروں کی امداد پر ہی گزارا ہوتا تھا۔ بادشاہ، جن کی حکومت دہلی تا پالم رہ گئی تھی، کبھی کبھار کچھ بھیج دیتے تھے۔ اب میرؔ پچاس برس کے ہو چکے تھے اور شب و روز کا مشغلہ صرف شاعری ہوگئی تھی۔ سودا دہلی چھوڑ چکے تھے اور لکھنؤ میں مقیم تھے۔ دیگر ہمعصروں میں میر درد، مظہرؔ اور حاتمؔ ممتاز تھے۔ حاتمؔ کے شاگرد بقاؔ سے میرؔ کی چشمک رہی اور دونوں نے ایک دوسرے کی ہجویں کہیں۔ میرؔ کی ہجویہ مثنوی 'اژدر نامہ' اسی زمانے کی تخلیق ہے۔

ان حالات کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ اپنے والد کی وفات سے پہلے موصوف کی درویشی کے طفیل میرؔ نے تنگی میں گزر اوقات کی اور اُن کے انتقال کے بعد سے پچاس برس کی ادھیڑ عمر ہونے تک میرؔ کو زندگی میں سرد ساعتوں کے جھونکے چند ایک ہی نصیب ہوئے ورنہ اُن کی تمام عمر پریشانی، غریبی اور محرومیوں کے صحرا میں جھلتے ہوئے بیتی۔ اپنے اردگرد انھوں نے لُوٹ کھسوٹ، تباہی، قتل و غارتگری اور خانہ جنگیاں ہی دیکھیں۔ آسودگی کا سایہ انھیں کہیں ہاتھ نہ آیا۔ ہندوستان کی عظیم مغلیہ سلطنت کو پارہ پارہ ہو کر بکھرتے ہوئے اور مالِ غنیمت کی طرح لٹتے ہوئے میرؔ نے قریب سے دیکھا۔ احمد شاہ ابدالی کے بار بار کے حملوں کو دہلی کی طرح میرؔ کے دل نے بھی جھیلا۔ جس انقلاب نے دہلی کو روند کر ریزہ ریزہ کیا، میرؔ مسلسل اس میں پستے رہے۔ یہ تمام باتیں چونکہ اُن کی ذات پر بیتی تھیں اور درد والم کی لہریں ان کے خون میں گردش کر رہی تھیں، اس لیے شدتِ احساس کے حامل، میرؔ کی شاعری اپنے وقت اور ماحول کے دُکھ درد اور مسائل کا آئینہ بن گئی۔ ظاہر ہے اُس ماحول میں سانس لینے والوں کو اس کلام میں اپنا اور اپنے آس پاس کی زندگی کا مُنہ بولتا نقشہ نظر آیا۔ اس لیے میرؔ کو مقبولِ عام شاعر تو ہونا ہی تھا۔ اتنا عظیم شاعر، جسے اپنے عظیم ہونے کا بھرپور احساس بھی تھا، دہلی میں فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ حد درجہ غیرت مند تھا لیکن زندگی دوسروں کی امداد کے سہارے بسر کرنے پر مجبور تھا، جس کا مکان دِلّی میں شیخ چلّی کے روضے کی حیثیت سے مشہور تھا۔ بادشاہ خود فقیر تھا، معاونت کرنے والے رؤسا اور داد و دہش کا حوصلہ رکھنے والے امراء خود روٹیوں کے محتاج ہو چکے تھے ایسے میں میرؔ کو کسی بھی بیرونی امداد کے قبول کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوتا۔ 1772ء سے 1782ء تک ایسے عالم میں دِلّی میں رہتے ہوئے میرؔ کے دل پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جابسنے کی خواہش اُن کے دل میں بہت دنوں سے کروٹیں لے رہی تھی۔ 1769ء میں وزیر الممالک نواب قمر الدین خاں کی پوتی شمس النساء بیگم کا نکاح آصف الدولہ سے ہوا تھا، اس موقع پر جو واقعات رونما ہوئے اُن کی منظر کشی میرؔ کی مثنوی 'دربیانِ کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر' میں کی گئی ہے۔ یہ مثنوی میرؔ کی، لکھنؤ منتقل ہونے کی، آرزو کا تخلیقی اظہار ہے۔

تا زندگی میؔر سے برگشتہ اُن کی قسمت اب کچھ اس طرح مہربان ہوئی کہ 1781ء میں اودھ کے نواب آصف الدولہ کو خواہش ہوئی کہ میر تقی میؔر کو لکھنؤ بلایا جائے تا کہ اُس کمی کا ازالہ ہو جو سوؔدا جیسے بلند شاعر کی وفات سے واقع ہوگئی تھی۔ یہ وہی کشادہ دست نواب ہے جس کے بارے میں مشہور تھا:

جس کو نہ دے مولا　　اُس کو دے آصف الدولہ

آصف الدولہ نے جب اپنے اس خیال کا اظہار سالار جنگ سے کیا، جو اُن کے ماموں تھے تو انھوں نے دہلی میں میؔر کی شدید بے سرو سامانی کے پیش نظر مشورہ دیا کہ میؔر کو لکھنؤ آنے کی دعوت کے ساتھ بطور زادِ راہ کچھ رقم بھی بھیجی جائے تو مناسب ہے۔ یہی ہُوا بھی، طلبی کا پروانہ اور زادِ راہ ملتے ہی میؔر نے لکھنؤ کا ارادہ باندھا اور دہلی کے خرابے کو خیر باد کہا حالانکہ جب اُن کے ماموں خانِ آرزو دہلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے تھے تو میؔر نے ان کی بہت مذمت کی تھی۔ میؔر نے راستے میں کہیں قیام کرنے سے بھی پرہیز کیا۔ ہر چند کہ فرخ آباد کے رئیس مظفر جنگ نے انھیں کچھ دن مہمان رکھنے پر بہت اصرار کیا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی میؔر نی الفور سالار جنگ سے ملے۔ چار پانچ دن بعد نواب آصف الدولہ مرغ بازی کی غرض سے سالار جنگ کے ہاں آئے تو میؔر سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میؔر کو اپنا کلام سنایا تو انھوں نے کہا ''کلام الملوک ملوک الکلام'' میؔر نے موقع مناسب دیکھ کر اپنے کچھ شعر بھی سنائے۔ وقت رخصت سالار جنگ نے میؔر سے متعلق یاددہانی کی تو نواب نے میؔر کو چند روز کے بعد دربار میں پیش ہونے کا حکم دیا۔ میؔر نے وہاں پہنچ کر قصیدہ پیش کیا۔ نواب نے اظہارِ مسرت کیا اور میؔر کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ تنخواہ تین سو روپے ماہانہ مقرر ہوئی، خاطر نشاں رہے کہ دہلی کی سرکاروں سے میؔر کو زیادہ سے زیادہ نواب جاوید خاں کے ہاں سے بائیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ 1782ء کے آس پاس کا زمانہ ہے۔

اس ملازمت کے دوران آصف الدولہ شکار کی غرض سے جوار بہرائچ کے جنگلات میں گئے تو میؔر کو ہمرہی کا شرف بخشا گیا اور میؔر نے ''شکار نامہ'' منظوم کیا۔ دوسری مرتبہ شمالی

سلسلۂ کوہ کی گھاٹیوں کا انتخاب شکار کے لیے کیا گیا جہاں سے تین مہینے کے بعد واپسی ہوئی۔ غالباً میرؔ اس بار بھی نواب کے ساتھ تھے کیونکہ اُن کے کلیات میں ایک دوسرا ''شکارنامہ'' بھی شامل ہے جس کی دو غزلوں کی تضمین آصف الدولہ نے مخمس میں کی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ میرؔ نے لکھنؤ میں دوسری شادی بھی کی تھی۔ چونکہ میرؔ کے بڑے بیٹے فیض علی فیضؔ اور چھوٹے بیٹے حسن عسکری عرشؔ کی عمروں میں بہت فرق ہے لہٰذا دونوں ایک ہی ماں کے بطن سے نہیں ہو سکتے۔ میرؔ کو جو ماہانہ مشاہرہ آصف الدولہ کے فرمان سے جاری کیا گیا تھا، موصوف نواب کی زندگی بھر باقاعدگی سے ادا کیا جاتا رہا۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں یہ سلسلہ البتہ چند دنوں کے لیے موقوف ہو گیا تھا لیکن دوبارہ جاری کر دیا گیا۔

میرؔ نے لکھنؤ میں اکتیس برس آرام سے گزارے۔ ان کا انتقال 20 ستمبر 1810ء کو ہوا۔ زندگی کی آخری سانس جمعہ کے دن شام کے وقت لی اور دوسرے دن دوپہر کو لکھنؤ کے، اس وقت کے مشہور قبرستان اکھاڑہ بھیم راؤ میں ان کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرؔ کا یہ مقطع ان کی زندگی اور موت پر کتنا صادق آتا ہے:

فکرِ معاش یعنی غمِ زیست تابہ کے
مر جایئے کہیں کہ ٹک آرام پایئے

تصانیفِ میرؔ

1. **کلیاتِ اردو :** اس میں چھ دواوین شامل ہیں جن میں غزلیات اور مثنویوں کے ساتھ ساتھ اس عہد میں مروج کم و بیش تمام اصناف سخن فردیات، رباعیات، مربع، مسدس، مخمس، ترجیع بند، ترکیب بند، مثلث، شہر آشوب مرثیے، قصائد، واسوخت، ہجویات، ساقی نامہ، قطعات وغیرہ موجود ہیں۔ یہ کلیات فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے 1811ء میں شائع ہوا تھا۔ حال ہی میں اس کا اضافہ و ترمیم شدہ ایڈیشن قومی کونسل برائے فروغ اردو نے چھاپا ہے۔ ان چھ دواوین میں میرؔ کی 1916 غزلیں شامل ہیں اور کل اشعار کی تعداد 13908 ہے۔ غزلوں کے بعد کلیات میرؔ میں سب سے زیادہ تعداد مثنویوں کی ہے جو سینتیس تک پہنچتی ہے۔

2. **فارسی دیوان :** یہ تاحال غیر مطبوعہ ہے البتہ اس کے قلمی نسخے کئی جگہوں پر محفوظ ہیں۔

3. **نکات الشعراء :** فارسی نثر میں اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جسے شمالی ہند کے تذکروں میں شرف اولیت حاصل ہے۔ اس میں 103 اردو شاعروں کے مختصر حالات اور اُن کا منتخب کلام شامل ہے۔ ''نکات الشعراء'' اپنے مواد کے اعتبار سے بھی بیش قیمت ادبی معلومات کے خزانے کی حیثیت رکھتا ہے۔

4. **فیضِ میرؔ :** میرؔ کی ایک مختصر فارسی تصنیف ہے جو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے فیض علی کی تعلیم کے لیے قلمبند کی تھی۔ اس میں مجذوب فقیروں اور خدا رسیدہ بزرگوں کے واقعات اور مافوق الفطرت کرامات وغیرہ کہانیوں کے پیرائے میں بیان کی گئی ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ تصوف کے بنیادی تصورات پڑھنے والے کے ذہن نشین ہوجائیں۔

5. **دریائے عشق (فارسی نثر)** : میرؔ نے متعدد مثنویاں تخلیق کیں جو اُن کے کلّیات میں شائع کی گئی ہیں ان میں مثنوی 'دریائے عشق' بھی ہے۔ اسی قصے کو میرؔ نے فارسی نثر میں بھی قلمبند کیا ہے۔

6. **ذکرِ میرؔ** : میرؔ کی خودنوشت سوانح عمری ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے۔ اس میں میرؔ نے اپنے حالات اور خانگی معاملات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے تاریخی واقعات بھی، جن میں نادر شاہ کے حملے، غلام قادر روہیلہ کے ظلم وستم اور مراٹھوں کی تاخت و تاراج کے حالات شامل ہیں، دلنشیں اور پُر تاثیر پیرائے میں تحریر کیے ہیں۔ میرؔ کی اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے جو نثار احمد فاروقی کے قلم کا رہینِ منّت ہے۔

شخصیت

تری چال ٹیڑھی تری بات رُوکھی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے
(میرؔ)

انسان کی شخصیت اور سیرت کی تشکیل و تعمیر میں اس کے بچپن کا بڑا ہاتھ ہوا کرتا ہے۔ میرؔ ایک درویش کے بیٹے تھے۔ توکل، قناعت اور خودداری انھیں ورثے میں ملے۔ اُن کے والد نے بالکل کم سِنی کے زمانے سے ہی میرؔ کو تلقین کرنا شروع کر دیا تھا کہ بیٹے شیوۂ عشق اختیار کرو کہ دنیا کے کارخانے میں اسی کا تصرّف ہے۔ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے۔ کائناتِ عالم میں جو کچھ بھی ہے وہ عشق ہی کے مظاہر ہیں۔ یہی ہدایت میرؔ کے مُنہ بولے چچا امان اللہ انھیں لڑکپن میں کرتے رہے۔ ماں بچپن میں گزر چکی تھیں۔ میرؔ ابھی گیارہ برس کے ہی تھے کہ اُن کے باپ کا انتقال ہوگیا اور وراثت میں والد کی طرف سے مال و دولت کی جگہ قرض کا بوجھ ملا، چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کی کفالت کے ذمہ دار بھی میرؔ ہی تھے۔ دوسری طرف دہلی کی تباہی اور تاراج کا اندوہناک سلسلہ تھا۔ اس طرح غمِ ذات اور غمِ کائنات کی چکی میں نوعمری سے ہی پستے ہوئے میرؔ کی شخصیت کا خمیر اُٹھا جس کے نقوش اُن کی شاعری اور اُن کے مزاج میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان ہی داخلی اور خارجی حالات نے میرؔ کو حد درجہ حساس اور نازک مزاج بنا دیا تھا۔ میرؔ کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ وہ اپنی ذات کے اسیر تھے اور باطنی کیفیات کی سیر میں اتنے محو رہے کہ باہر کی کھڑکیوں سے جہانِ خارج کا مشاہدہ ہی نہیں کیا۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ میرؔ بیرونی دنیا سے بے نیاز ہوکر محض اپنے غموں اور ذاتی مسائل میں محو نہیں رہے۔ وہ اپنے دَور کی سیاسی اُلٹ پلٹ کے صرف شاہد ہی نہیں تھے بلکہ اس میں شریک بھی تھے اور اس سے متاثر بھی۔ اُن کی خودنوشت سوانح عمری ''ذکرِ میرؔ'' میں ہر صفحے پر شہادتیں ملتی ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے طوفان خیز حالات میں ڈوبتے اور تیرتے رہے ہیں اور زمانے کی ستیزہ کاریوں کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ اُس شاعر نے، جسے عموماً گوشہ نشیں اور مردم بیزار تصور کیا گیا، اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ سفر کیے اور تقریباً پچیس برسوں تک متعدد امراء کی سرکاروں میں ملازمت کی۔ کہیں سپاہی کی حیثیت سے کہیں مصاحب کی طور پر۔ انہوں نے جنگوں میں شرکت بھی کی اور سفارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ زمانے کے نشیب و فراز کو

کھلی آنکھوں سے دیکھا، طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں، اپنے گھر کی مسماری کا منظر دیکھا جس میں اُن کا بیٹا دب گیا، دلّی کو بار بار لٹتے اور اجڑتے دیکھا، لاکھوں آدمیوں کا قتلِ عام ان کے سامنے ہُوا، بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے دیکھیں، لکھنؤ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں بیگمات کی بے آبروئی اور لٹنے کے چشم دید گواہ بنے، مرہٹوں اور روہیلوں کے ہاتھوں دہلی کی تاخت و تاراج کے غم ناک حادثے دیکھے، سکھوں اور جاٹوں کی غارتگری کا مشاہدہ کیا، انگریزوں کی دہلی پر یلغار بھی میرؔ کی آنکھوں کے سامنے ہوئی۔ میرؔ کے مزاج اور طبیعت میں حُزن وحرماں اور سوز و گداز کے سرچشمے، یہی واقعات ہیں۔

احمد شاہ ابدالی کے لشکر کی یلغار اور تاخت و تاراج کا حال ''ذکرِ میرؔ'' میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''شام کے بعد منادی ہوئی کہ بادشاہ نے امان دے دی ہے، رعایا کو چاہیے کہ پریشان نہ ہو مگر جب گھڑی بھر رات گزری تو غارت گروں نے ظلم و ستم ڈھانا شروع کیے۔ شہر کو آگ لگادی، صبح کو، جو صبحِ قیامت تھی، تمام شاہی فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل و غارتگری میں لگ گئے، دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو قید کرلیا۔ بہتوں کو جلادیا اور سر کاٹ لیے۔ ایک عالم پر یہ مظالم توڑے اور تین دن تک ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا ...... ایک وقت کے کھانے اور ستر ڈھکنے کے وسائل بھی کسی کے گھر میں نہ رہے۔ مردوں کے سر ننگے تھے اور عورتوں کے پاس اوڑھنی نہ تھی۔ چونکہ راستے بند تھے بہت سے لوگ زخم کھا کھا کر مر گئے، کچھ سردی کی شدت سے اکڑ گئے۔ بڑی بے حیائی سے لوٹ مچائی اور بے آبرو کیا۔ غلّہ زبردستی چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے فروخت کرتے۔ ان غارت گروں کا شور و ہنگامہ ساتویں آسمان تک پہنچ رہا تھا مگر بادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا، استغراق کے باعث سُنتا ہی نہ تھا ...... ہزاروں خانہ خراب اس ہنگامے سے نکل کر بصد حسرت ترکِ وطن

کر گئے۔ ایک عالم ان کے ستم سے ہلاک ہوگیا مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ پرانے شہر کا علاقہ، جسے جہانِ تازہ کہتے تھے، کسی گری ہوئی منقش دیوار کی مانند تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں ہی نظر آتے تھے۔ جہاں تک آنکھ دیکھتی تھی، خاک سیاہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں کہ فقیر تھا اب زیادہ مفلس ہوگیا۔ سڑک کے کنارے جو مکان رکھتا تھا، وہ ڈھے کر برابر ہوگیا۔'' (فارسی سے ترجمہ)

'ذکر میرؔ' سے ثابت ہوتا ہے کہ میرؔ نے ان حالات میں زندگی بسر کرتے ہوئے ایک زندہ، حساس اور باشعور انسان کی طرح ماحول کا بخوبی مشاہدہ کیا اور زمانے کے کرب کو اپنے تخلیقی وجود میں جذب کیا۔

ایسا بھی نہیں کہ غم واندوہ کے سامنے میرؔ سرتاسر پسپا ہوگئے ہوں۔ وہ ایک سرگرم اور متحرک انسان کی طرف میلے ٹھیلوں میں بھی نظر آتے ہیں، اپنے احباب پر فقرے بھی چسپاں کرتے ہیں، دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور ہنسی مذاق بھی کرتے ہیں۔ 'ذکر میرؔ' میں بیان کردہ اُن کے لطیفوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو رنج والم کے بحر بے کنار میں تیرتے ہوئے ہنس کر اور ہنسا کر زندگی کرنا بھی آتا تھا اور اُن کے مزاج میں حسِ لطیف اور ظرافت کی کمی نہیں تھی نہ ہی وہ عام زندگی سے بے تعلق تھے۔

میرؔ کے تذکرے 'نکات الشعراء' کے مطالعے سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ خدائے سخن تسلیم کیے جانے والے میرؔ، کوئی مافوق الفطرت اور فرشتہ سیرت انسان نہیں تھے بلکہ ایک عام آدمی کی طرح مجموعۂ تضاد، خیر وشر کا امتزاج اور بشری خوبیوں اور خرابیوں کے حامل زندگی کی حرارت سے بھرپور شاعر تھے۔ انھوں نے دہلی کے مشاعروں میں کامیاب ہونے کے لیے وہ تمام حربے بے تکلف استعمال کیے جو عام طور پر شاعر کام میں لاتے ہیں۔ وہ گٹ بندی بھی کرتے ہیں اور ہمعصروں کو زک پہنچانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اپنی مثنوی ''اژدر نامہ'' میں دہلی کے سارے شاعروں کو کیڑے مکوڑے قرار دے کر وہ اپنے آپ کو ایسا اژدہا بتاتے

کر گئے۔ ایک عالم ان کے ستم سے ہلاک ہوگیا مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ پرانے شہر کا علاقہ، جسے جہانِ تازہ کہتے تھے، کسی گری ہوئی منقش دیوار کی مانند تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں ہی نظر آتے تھے۔ جہاں تک آنکھ دیکھتی تھی، خاک سیاہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں کہ فقیر تھا اب زیادہ مفلس ہوگیا۔ سڑک کے کنارے جو مکان رکھتا تھا، وہ ڈھے کر برابر ہوگیا۔'' (فارسی سے ترجمہ)

'ذکر میرؔ' سے ثابت ہوتا ہے کہ میرؔ نے ان حالات میں زندگی بسر کرتے ہوئے ایک زندہ، حساس اور باشعور انسان کی طرح ماحول کا بخوبی مشاہدہ کیا اور زمانے کے کرب کو اپنے تخلیقی وجود میں جذب کیا۔

ایسا بھی نہیں کہ غم واندوہ کے سامنے میرؔ سرتاسر پسپا ہوگئے ہوں۔ وہ ایک سرگرم اور متحرک انسان کی طرف میلے ٹھیلوں میں بھی نظر آتے ہیں، اپنے احباب پر فقرے بھی چسپاں کرتے ہیں، دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور ہنسی مذاق بھی کرتے ہیں۔ 'ذکر میر' میں بیان کردہ اُن کے لطیفوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو رنج والم کے بحرِ بے کنار میں تیرتے ہوئے ہنس کر اور ہنسا کر زندگی کرنا بھی آتا تھا اور اُن کے مزاج میں حسِ لطیف اور ظرافت کی کمی نہیں تھی نہ ہی وہ عام زندگی سے بے تعلق تھے۔

میرؔ کے تذکرے 'نکات الشعراء' کے مطالعے سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ خدائے سخن تسلیم کیے جانے والے میرؔ، کوئی مافوق الفطرت اور فرشتہ سیرت انسان نہیں تھے بلکہ ایک عام آدمی کی طرح مجموعۂ تضاد، خیر وشر کا امتزاج اور بشری خوبیوں اور خرابیوں کے حامل زندگی کی حرارت سے بھرپور شاعر تھے۔ انھوں نے دہلی کے مشاعروں میں کامیاب ہونے کے لیے وہ تمام حربے بے تکلف استعمال کیے جو عام طور پر شاعر کام میں لاتے ہیں۔ وہ گٹ بندی بھی کرتے ہیں اور ہمعصروں کو زک پہنچانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اپنی مثنوی ''اژدرنامہ'' میں دہلی کے سارے شاعروں کو کیڑے مکوڑے قرار دے کر وہ اپنے آپ کو ایسا اژدہا بتاتے

ہیں جو ایک سانس میں ہی سب کو نگل جاتا ہے۔ معاصرین میں سے کچھ نے اُن کی ہجویں کہی تھیں اور میرؔ نے بھی جواب میں اُن کے خلاف ہجویں لکھی تھیں۔ ہم عصر شاعروں سے اُن کی چشمکیں ثابت کرتی ہیں کہ میرؔ زندگی سے بھرپور دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنی نثری تحریروں اور شعروں میں میرؔ نے امرد پرستی کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ایک عام آدمی کی طرح میرؔ نے بھی اپنے والد اور خاندان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ ناراض ہوئے تو اپنے سوتیلے ماموں اور محسن و مربّی، خان آرزوؔ کے سارے احسانات کو بھلا کر اُن کے کردار کی پستیوں کو مبالغے کے ساتھ نمک مرچ لگا کر پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ اُن سے شاعری کے رموز سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے کا پوری طرح اعتراف بھی نہیں کیا بلکہ چھپانے کی کوشش کی۔

میرؔ کو بجا طور پر اپنے کمال شاعری پر ناز تھا اور اسی اعتبار سے یہ احساس بھی شدید تھا کہ زمانے نے اُن کی خاطر خواہ قدر نہیں کی لیکن میرؔ کا یہ گلہ صدفی صد درست بھی نہیں ہے۔ اُن کا زمانہ ہی پُر آشوب اور سخت بدامنی کا شکار تھا لیکن اس نفسانفسی کے دور میں بھی معاشرے نے میرؔ کو بالکل ہی نظر انداز نہیں کیا۔ رعایت خاں نے میرؔ کے آڑے وقت میں انھیں سہارا دیا لیکن اُس کی اس خطا پر کہ موصوف نے میرؔ سے فرمائش کی تھی کہ ایک میراثی زادے کو گانے کے لیے اپنے کچھ شعر حفظ کرا دیں، میرؔ نے تنگ کر ملازمت چھوڑ دی لیکن میرؔ کا لحاظ کرتے ہوئے رعایت خاں نے اُن کے چھوٹے بھائی کو ملازم رکھ لیا۔ جگل کشور، راجا ناگرمل، صفدر جنگ، نواب بہادر جاوید خاں، رائے بہادر سنگھ، شاہ عالم وغیرہ نے وقتاً فوقتاً میرؔ کی دستگیری کی۔ تقریباً پچاس برس کی عمر تک میرؔ نازک مزاج اور غیرتمند تو نظر آتے ہیں لیکن انھیں بدماغی یا مردم بیزاری سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

سکرتال کے معرکے کے بعد وہ دہلی آکر گوشہ گیر ہو گئے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے سفارت میں کیے گئے اپنے عہد و پیمان کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے وہ ناگرمل سے قطع تعلق کر کے اس کے بڑے بیٹے رائے بہادر سنگھ کے متوسل ہو گئے تھے۔ یہیں سے اُن کی بدماغی

کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں تھی کہ لکھنؤ میں معاشی فارغ البالی حاصل ہونے کے باوجود وہ عوام تو کجا اپنے محسن نوابین کے ساتھ بھی تنگ مزاجی اور کج ادائی سے کام لیتے دکھائی پڑتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں اور اس زمانے کے مختلف مصنفین نے اپنے تذکروں میں میرؔ کی نازک طبعی، بد دماغی اور تنگ مزاجیوں کے بہت سے قصے درج کیے جن میں سب نہ سہی، کچھ تو سچ ہوں گے مثلاً:

''قمر الدین منت اصلاح کے لیے اردو کی غزل لے گئے، میرؔ صاحب نے وطن پوچھا، انھوں نے سونی پت علاقہ پانی پت بتلایا، آپ نے فرمایا، سید صاحب اردوئے معلیٰ خاص دہلی کی زبان ہے آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے، اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجیے۔''

''دہلی سے لکھنؤ جاتے ہوئے گاڑی کے کرائے میں بچت کی غرض سے ایک شخص کو شریک سفر بنالیا، تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی، یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بات کی۔ میرؔ صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے صاحب قبلہ! آپ نے کرایہ دیا ہے بیشک گاڑی میں بیٹھیے مگر باتوں سے کیا تعلق؟ اس نے کہا حضرت کیا مضائقہ ہے، راہ کا شغل ہے، باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میرؔ صاحب بگڑ کر بولے، خیر آپ کا شغل ہے، میری زبان خراب ہوتی ہے۔'' (آب حیات)

نواب آصف الدولہ نے انھیں بلا کر بڑی عزت افزائی کی اور گرانقدر وظیفہ مقرر کیا۔ انھیں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ''ایک دن نواب مرحوم نے غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے تو پوچھا کہ میرؔ صاحب، ہماری غزل لائے؟ میرؔ صاحب نے تیوری بدل کر کہا، جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے نہیں ہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کردے۔'' (آب حیات)

''ایک دن آصف جاہ کتاب خانہ میں جلوہ گر تھے اور دواوین زیر و بالا رکھے ہوئے تھے۔ ایک جلد نواب نامدار کے ہاتھ سے بہت دور تھی اور میرؔ صاحب سے نزدیک، فرمایا مجھے

اُٹھا دیجیے۔ میر صاحب نے ایک خادم سے کہا۔ سنو تمھارے آقا کیا فرماتے ہیں۔'' (تذکرہ خوش معرکۂ زیبا - سعادت خاں ناصر)

''ایک دن میر سوز نے نواب کی فرمائش پر کچھ غزلیں سنائیں، میر موجود تھے۔ نواب نے میر سوز کی تعریف کی جو میر صاحب کو ناگوار گزری۔ لطیفہ یہ ہوا کہ میر سوز نے میر صاحب کی طرف دیکھا تو موصوف نے کہا، ''تمھیں اس دلیری پر شرم نہ آئی؟ ...... موقع اور محل تمھاری شعر خوانی کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈکلھیا پکتی ہو نہ کہ میر تقی کے سامنے۔'' (تذکرہ خوش معرکۂ زیبا)

''ایک دن شاہ قدرت اللہ قدرت اور میر صاحب کشتی پر سوار تھے۔ قدرت نے چند غزلیں اپنے دیوان کی پڑھیں۔ میر صاحب نے کچھ نہ کہا۔ آخر وہ ملتمس ہوا کہ آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ میر صاحب نے کہا صوابدید یہ ہے کہ تم دیوان کو اپنے، دریا میں ڈال دو۔'' (گلستانِ بے خزاں: قطب الدین باطن)

''عماد الملک نواب غازی الدین لب دریا بیٹھے ہوئے تھے، اتفاقاً میر صاحب ادھر سے آنکلے۔ نواب نے چند قصیدے اپنے، میر کے روبرو پڑھے اور داد طلب ہوئے۔ میر صاحب نے فرمایا میری مدح کی کیا احتیاج ہے۔ ہر بط کو صاحب۔ کے اشعار پر حالت وجدو سماع ہے۔'' (گلستانِ بے خزاں)

''سعادت یار خاں رنگین، نواب طہماسپ خاں بیگ قلعدار شاہی کے بیٹے تھے، چودہ پندرہ برس کی عمر تھی۔ بڑی شان و شوکت سے گئے اور غزل اصلاح کے لیے پیش کی۔ سُن کر کہا صاحبزادے آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں، نیزہ بازی، تیراندازی کی کسرت کیجیے، شہ سواری کی مشق فرمایئے۔ شاعری دل خراشی اور جگر سوزی کا کام ہے آپ اس کے درپے نہ ہوں۔ جب اُنھوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں، یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنا کیا ضروری ہے۔'' (آبِ حیات)

''لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کیوں حضرت آج کل شاعر کون ہے؟ کہا ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار ہے اور تامّل کر کے کہا، آدھے خواجہ میر درد۔ کوئی شخص بولا کہ حضرت! اور میر سوز۔ چیں بہ جبیں ہو کر کہا کہ میر سوز بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔ کہا کہ خیر یہ ہے تو پونے تین سہی، مگر شرفاء میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سُنے۔'' (آبِ حیات)

''گورنر جنرل اور اکثر صاحبانِ عالیشان جب لکھنؤ میں جاتے تو اپنی قدر دانی یا اس سبب سے کہ میر منشی علوِ حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے، میر صاحب کو ملاقات کے۔ لیے بلاتے تھے لیکن یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے یا تو میرے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں، میرا کلام سمجھتے نہیں، البتہ کچھ انعام دیں گے۔ ایسی ملاقات سے ذلّت کے سوا کیا حاصل۔'' (آبِ حیات)

عنفوان شباب میں جنوں کی شدت، زمانے کی تلخیوں اور بچپن سے جوانی تک مسلسل پریشان حالی، عسرت اور بیروزگاری کے ہاتھوں تکلیفیں جھیلنے کی وجہ سے میر کے مزاج میں زود رنجی اور جھنجلاہٹ کا پیدا ہو جانا فطری بات ہے۔ اپنی شاعری کی عظمتوں کا اُنھیں بخوبی اندازہ تھا اس لیے اَنا پسندی بھی افتادِ طبع کا جزو بن گئی تھی۔ درویشانہ ماحول اور متصوفانہ رجحان نے غیرت اور خودداری کو انتہا پر پہنچا دیا تھا۔ اس لیے مندرجہ بالا واقعات کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے بہ ایں ہمہ میر یکسر خشک مزاج، مردم بیزار، چڑچڑے اور زندگی سے بیزار رہنے والے آدمی نہیں تھے۔ اُن کے کلیات میں شوخ و شنگ اشعار بھی موجود ہیں، اپنی خودنوشت سوانح عمری کے اختتام پر انھوں نے بہت سے لطیفے بھی درج کیے ہیں جن میں سے بیشتر ناقابلِ اشاعت ہیں لیکن ان سے میر کے ظرافت پسند ہونے کے شواہد ملتے ہیں، کچھ لطیفے جو فحش نہیں ہیں، فارسی سے اُن کے ترجمے درج کیے جاتے ہیں:

1۔ ''الف ابدال ایک شاعر تھا اور الفؔ تخلص کرتا تھا۔ مدایا کا باشندہ تھا۔ شاہ عباس سے مصاحبوں، نے کہا کہ یہ مالدار آدمی ہے اس سے کچھ وصول کرنا چاہیے۔ شاہ نے اُسے طلب کیا اور کہا، سُنا جاتا ہے کہ تمھارے پاس بہت مال و زر ہے۔ اُس نے جواب دیا،'' میں آپ پر قربان جاؤں، آپ نے یہ تو سن لیا کہ میرے پاس بہت مال ہے مگر یہ نہیں سنا کہ الف خالی ہوتا ہے!''

2۔ ''ایک غریب سیّد اپنا وطن چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں دہلی آیا اور فاقہ کشی نے اُسے نحیف و نزار کر دیا۔ اُس نے اپنے وطن میں سورۂ 'قل یا ایہا الکافرون' بڑی سی لوح پر خطِ جلی میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔ ایک مکتب کی طرف اتفاقاً جانا ہوا تو وہاں یہی سورۃ خفی خط میں تحریر پاکر کہنے لگا، سبحان اللہ، وقت کے پھیر میں پڑ کر بیچاری سورۃ قُل بھی اصلی حالت میں نہیں رہ گئی، اتنی دُبلی ہوگئی ہے کہ پہچاننا مشکل ہے۔''

میرؔ کی شوخیِ طبع اور مزاج کی شگفتگی 'نکات الشعراء' میں اُن کے چبھتے ہوئے جملوں اور طنز و مزاح سے لبریز آراء سے بھی ہوتی ہے، مثال کے طور پر مختلف مواقع پر اُن کی رائے زنی ملاحظہ ہو:

1۔ قدرت اللہ قدرتؔ کے بارے میں لکھا ہے،''اگرچہ تخلص قدرت ہے مگر عاجزِ سخن ہے۔''

2۔ آبروؔ یک چشم تھے، اُن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں''دجال صفت دنیا کی بے توجہی کے باعث ان کی ایک آنکھ بیکار ہوگئی تھی۔''

3۔ نزلے کی وجہ سے شرف الدین مضمونؔ کے دانت گر گئے تھے میرؔ نے انھیں 'شاعرِ بیدانہ' کہا ہے۔

4۔ خاصی عمر میں میرؔ نے شادی کی۔ کسی نے پوچھا کہ اس پیرانہ سالی میں کدخدا ہونے کا کیا باعث ہوا؟ فرمایا فقط اس واسطے کہ سسرال والے کہیں، لڑکا آیا!

قصہ مختصر اپنے تذکرے کی روشنی میں میرؔ ایک ہنگامہ پرور، محفل آرا، فقرے باز چلت پھرت کے آدمی نظر آتے ہیں یہاں ملحوظ رکھنا ہوگا کہ میرؔ کے ہاں اکثر شعری نشستیں منعقد ہوا

کرتی تھیں۔ اپنی تصانیف 'ذکرِ میر' اور 'نکات الشعراء' کے تناظر میں میرؔ متتم المزاج اور محسن کش بھی دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے خان آرزو اور راجا ناگرمل جیسے محسنوں کا مضحکہ اُڑایا اور اپنے بہت سے ہم عصر شاعروں کی تضحیک میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ ایک ادبی سیاست بازکی حیثیت سے وہ اپنے حریفوں کو ذلیل کرنے اور ہم چشموں کی پگڑیاں اُچھالنے میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ باپ اور منہ بولے چچا کے کشف و کرامات کا تذکرہ اور انھیں آسمان کی بلندی پر پہنچانے کی کوشش بھی میرؔ نے جس انداز میں کی ہے اس سے اُن کی اصابت رائے مشتبہ ہوجاتی ہے اور لگتا ہے کہ میرؔ معروضی انداز میں بات کرنے سے معذور ہیں اور منصفانہ رویہ اختیار کرنا اُن کے لیے دشوار ہوتا ہے۔

''آبِ حیات'' کے مطابق ''میرؔ صاحب میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ تھے۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ، بات کم وہ بھی آہستہ، آواز میں نرمی اور ملائمت، ضعیفی نے ان سب صفتوں کو اور بھی قوی کیا تھا کیونکہ سو برس کی عمر آخر ایک اثر رکھتی ہے...... عادات و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین، اور صلاحیت اور پرہیز گاری نے اسے عظمت دی تھی، ساتھ ہی اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی......''

لباس کے بارے میں بھی آبِ حیات کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ان کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا پاجامہ ایک پورا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا، ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا، اس میں آویزاں، مشروع کا پاجامہ جس کی عرض کے پائینچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب......''

یہ وہ حلیہ ہے جس میں میرؔ صاحب پہلے پہل لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے تھے۔

شعری امتیازات

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے

چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

(میرؔ)

اکابرین ادب نے غزل گویوں کو تعلّی کا حق ابتداء سے دے رکھا ہے پھر میرؔ تو خدائے سخن تھے انھوں نے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں بظاہر تعلّیوں سے کچھ زیادہ ہی کام لیا۔ ان کے کلام میں تعلّی سے متعلق ابیات کی بہتات ہے لیکن ان کا تجزیہ کیجیے تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ واقعتاً یہ اشعار محض تعلّی نہیں بلکہ حقیقت سے بہت قریب ہیں مثلاً اس نوع کی باتیں:

میرؔ آوارۂ عالم جو سنا ہے تونے
خاک آلود وہ اے بادِ صبا میں ہی ہوں

یہ انھیں کے شعر ہیں:۔

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میرؔ کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

اور

سر سبز ہندہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے گونج میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

•

ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ پہ میرؔ
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

یا یہ ابیات:

ملکوں ملکوں، شہروں شہروں، قصبہ، قریہ، دیہہ، دیار
شعر و بیتِ غزل پر اپنی ہنگامہ ہے گھر گھر آج

•

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

•

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

•

ترک بچے سے عشق کیا تھا ریختہ کیا کیا میں نے کہے
رفتہ رفتہ ہندوستاں سے شعر مرا ایران گیا

اور یہ محض تعلّی ہی نہیں ہے یا یہ محض میرؔ کی خوش گمانیاں ہی نہیں تھیں۔ میرؔ کے ہم عصروں نے اُن کی برتری کو کھُل کر تسلیم کیا تھا۔ سوداؔ کا مقطع ہے:

سوداؔ تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

بعد کی نسلوں میں بھی ان کی عظمت کا بڑھ چڑھ کر اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ ناسخؔ نے کہا ہے:

شبہ ناسخؔ ہے کسے میرؔ کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

اور اس مصرعے کو غالبؔ نے بھی دہرایا تھا:

غالبؔ اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

غالبؔ صرف اس ایک مصرعے کی تضمین کر کے ہی نہیں رہ گئے، انھوں نے ایک اور مقطع میں بھی میرؔ کی استادی کا اعتراف کیا ہے جو مرزا نوشہ جیسے انا پسند شاعر کے ہاں بڑی بات ہے۔ کہتے ہیں:

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اور غالبؔ کے ہمعصر استاد ذوقؔ نے بھی میرؔ کی استادی کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اُن کے آگے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف بھی کیا ہے، اُن کا مشہور مقطع ہے:

نہ ہوا پر نہ ہُوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

تو یہ جو میرؔ کی خوبیوں کا، ان کے کلام کی گہرائی کا، ان کے تجربات کی وسعت کا، ان کے طرز اظہار کے تنوع کا اعتراف میرؔ کے عہد سے لے کر آج تک کیا جارہا ہے اور تقریباً ڈھائی سو برسوں سے ارباب ادب نے انھیں ''خُدائے سخن'' کی حیثیت سے شاعری کے بلند ترین منصب پر فائز کر رکھا ہے تو اس کے اسباب بھی ہیں، محض اینٹ پر اینٹ نہیں رکھی جارہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرؔ کے دواوین کی ورق گردانی کرتے ہوئے قدم قدم پر ہماری نگاہیں ایسی بیتوں پر اٹکتی ہیں جن میں یا تو اسلوب تازہ برتا گیا ہے یا لفظ تازہ کا استعمال کیا گیا ہے، ورنہ تازہ مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ اسلوب، زبان اور خیال کی ندرتوں کا ایک ایسا بحر ذخار میرؔ کی غزلیات میں ٹھاٹھیں مارتا ہے کہ پڑھنے والے کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جانے کیسے لوگوں نے کہہ دیا اور کیسے اس بات کو تسلیم کرلیا گیا کہ میرؔ کا کلام 'بلندش بلند و پستش پست' ہے۔ جہاں بلندی ہے تو بے تحاشا بلندی ہے اور جہاں پستی ہے تو بے حد پستی ہے۔ کلام میرؔ بلندی کا تو واقعی احساس دلاتا ہے لیکن وہ پستی جسے 'پستش پست' کہہ سکیں میرے خیال میں دواوینِ میرؔ میں معدودے چند مقامات پر ہی محسوس ہوتی ہے، وگرنہ میرؔ کی معمولی باتوں میں بھی گہرے رموز پوشیدہ ہوتے ہیں اور ان کی بات میں سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ جو شاعرانہ والہیت، کیفیت، ربودگی، دل سوزی اور گداز میرؔ کے کلام میں ہے وہ انھیں عظیم فنکار تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اتنا بہت سا کہنے کے باوصف ان کے ہاں سپاٹ اور بے کیف اشعار کم سے کم ہیں۔ اب دیکھیے کہ میرؔ کا جو شعر تعلّی کے ضمن میں بطور

مثال پیش کیا جاچکا ہے............... چلیں ٹک میرؔ کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے ...... یہ جو لفظوں کو موتی سے پرونے کا دعویٰ ہے، پیش کردہ مصرعے سے ہی لگتا ہے کہ لفظ نہیں موتی پرو دیے گئے ہیں۔ 'چلیں ٹک میرؔ کو سننے'...... 'ٹک' جیسا بازاری لفظ کیسا لطف دے رہا ہے۔ پھر بندشِ الفاظ کی خوبی بیان کرنے کے لیے موتی سے پرونے کی بات! اس طرح متعدد شعروں میں میرؔ کے موتی سے پرونے کا عمل بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے کہتے ہیں:

آنکھوں سے جو حال پوچھا دل کا
اک بوند ٹپک پڑی لہو کی

•

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

•

کیا جانے چشمِ تر کے اُدھر دل کو کیا ہوا
کس کو خبر ہے میرؔ سمندر کے پار کی

•

مہر و وفا اخلاص و مروّت واقف ان میں اک سے نہیں
یوں تو وہ ظالم رمز و اشارہ، طنز و کنایہ جانے ہے

•

اے شب ہجر راست کہہ تجھ کو
بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

•

اس نوع کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں ابیات مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ اَب دیکھیے فقرہ 'اے شب ہجر راست کہہ'...... 'راست کہہ' کی جگہ آسانی سے ''سچ بتا'' رکھا جاسکتا

تھا کوئی عام شاعر یوں ہی کہتا...... 'اے شبِ ہجر سچ بتا تجھ کو، لیکن 'راست کہہ تجھ کو...... بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے...... میں جو تیکھا پن، جو نشتر کی سی چبھن، جو ڈھرّے سے الگ قسم کی ساخت ہے، ایسی کہ مصرع سیدھے سماعت سے چھن کر دل میں اُترا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مصرع...... کیا جانے چشمِ تر کے اُدھر دل کو کیا ہوا...... میں جو استعجابیہ کیفیت ہے نیز 'چشمِ تر' اور 'سمندر' کا رشتہ جس خوبی کے ساتھ اُجاگر ہوتا ہے، اس کا مزا اہلِ ذوق سے پوچھیے۔ مزید براں میرؔ نے چشمِ تر، سمندر اور دلِ پُر خوں، وغیرہ کے تعلق سے جو متعدد شعر کہے ہیں، وہ سب کمک پر آ کر زیرِ بحث شعر کو جال سے بلندی پر اُچھالنے کے لیے تیار ہیں۔ میر کا یہ تخلیقی عمل موتی پرونے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔ تعلّی کے ذیل میں میرؔ کا جو ایک اور مقطع پیش کیا گیا تھا ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں:

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ پہ میرؔ
جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میرؔ نے ایک دو نہیں ہزاروں زمینیں ایجاد کی ہیں اور ان میں ایک سے بڑھ کر ایک نفیس بیت نکالی ہے اور ان کی ایجاد کردہ زمینوں میں آج تین سو برس گزر جانے کے باوجود نمی اور ایسی قوتِ نمو موجود ہے کہ میرؔ کے معاصرین سے لے کر غالبؔ و ذوقؔ پھر داغؔ و امیرؔ مینائی اور پھر فراقؔ و آثرؔ لکھنوی تک اُن سے اثر قبول کرتے رہے۔ بعد ازاں میرؔ سے اثر پذیری کا یہ سلسلہ ابنِ انشا، ناصر کاظمی، خلیل الرحمان اعظمی وغیرہ تک پہنچا۔ ایک طویل فہرست ہے نئے دَور کے شاعروں کی جو میرؔ سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ کون شاعر ہے جس نے میر تقی میرؔ کی زمینوں میں شجرکاری نہیں کی اور زیادہ سے زیادہ گُل بوٹے اور مضامینِ تازہ کے ثمر نہیں حاصل کیے۔ نئی نئی زمینیں ایجاد کرنا اور انھیں تا آسمان لے جانا میرؔ کے کمالات میں سے ہے اور جب وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں تو کوئی تعلّی نہیں کرتے بلکہ اسے بیانِ واقعہ سمجھنا چاہیے جسے تعلّی کا نام دینا ہی میرؔ کے ساتھ زیادتی

ہوگی۔ اسی طرح تعلّی کے ضمن میں پیش کردہ دیگر اشعار کا معاملہ ہے کہ میرے شعر کی دھوم سارے دکن میں ہے، میرے سخن کا شور حشر تک جانے والا نہیں ہے یا میرے ریختوں کو لوگ گلیوں گلیوں پڑھتے پھریں گے یا میرا شعر ہندوستان سے ایران گیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں بھی صحیح معنوں میں تعلّی کی حامل نہیں بلکہ حقیقت پر مشتمل ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ڈھائی سو برس آگے چل کر پیش آنے والے معاملات بھی اُس روشن ضمیر فنکار پر روشن تھے۔ آج بھی میرؔ کی ابیات صرف دکن، ہندوستان یا ایران تک محدود نہیں بلکہ دُنیا بھر میں جہاں جہاں اردو جاننے والے ہیں، میرؔ کے اشعار کی گونج انھیں سنائی دیتی رہتی ہے۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو میر تقی میرؔ کے ہاں جو انفرادیت ہے اور اُن کے کلام میں جو رچاؤ ہے ان کے شعروں میں جو سوز، گداز و تاثیر ہے، اس کے اسباب مختلف ہیں اور اس کی بہت سی تعبیریں اور تاویلیں کی جاسکتی ہیں۔ اکثر ناقدین کی محدود رسائی میرؔ کے تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں تک نہیں ہو پاتی پھر بھی چند نکات کی طرف اشارے کرنا چاہتا ہوں۔ مثال کے طور پر میرؔ اپنے شعروں کو بات چیت کے پیرائے میں، کبھی ہمکلامی اور اکثر خود کلامی کے انداز میں بغیر کسی آرائش کے پیش کرتے ہیں۔ بناوٹ اور تصنع سے میرؔ کی طبیعت میل نہیں کھاتی اور اہلِ نظر دیکھتے ہیں کہ کلام میرؔ میں آراستگی کے عناصر بہت ہی کم ہیں حالانکہ شاعری تو کام ہی رعایتِ لفظی کا ہے۔ جس طرح مچھلی کے ریشے ریشے میں کانٹے پیوست ہوتے ہیں وہی عالم شاعری میں صنائع اور بدائع کا ہے۔ یہ ہمارے خدائے سخن کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنی ابیات میں ان حربوں کو کم برتا ہے اور جہاں برتا ہے تو ایسی ہنر مندی کے ساتھ کہ پُر کاری میں سادگی جھلکتی ہے۔ میرؔ کے ہاں ہُنت یا بناوٹ میں بھی فطری بھولپن اور سادگی کا التباس ہوتا ہے اور یہ بات بڑی فنکارانہ مہارت کا مطالبہ کرتی ہے کہ شعر بہت محنت سے، سوچ سمجھ کر اور بنا سنوار کر کہا جائے اور پڑھنے والے کو محسوس ہو کہ بالکل سامنے کی بات ہے اور بیساختہ کہہ دی گئی ہے۔ میرؔ کے کلام میں وہ جو قبائے گُل میں گُل بوٹا نہیں ہے، والی کیفیت ہے اُسے حاصل کر لینا معمولی غزل گو کے بس کی بات نہیں۔

مطالعۂ میرؔ میں ایک اور پہلو پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔ شاعری صرف بات کو دل نشیں انداز میں کہہ دینے کا نام نہیں ہے۔ شاعر کے پاس کہنے کے لیے نئی نئی باتیں نہ ہوں، نُو بہ نُو تجربات کی کمی ہو تو وہ جلد ہی خود کو دہرانے لگتا ہے۔ میرؔ نے اتنا بہت سا کہا ہے پھر بھی انھیں پڑھتے یا سنتے ہوئے کبھی بیزاری اور اُکتاہٹ نہیں ہوتی کیونکہ اُن کے پاس زندہ تجربات کا بے پناہ ذخیرہ ہے اور کہنے کے لیے بہت نئی نئی باتیں۔ پھر بات کہنے کا وہ خوش سلیقہ انداز جو عمومیت کا حامل ہوتے ہوئے بھی عامیانہ نہیں۔ عمومیت ایسی کہ میرؔ اپنی بیتی کہیں اور ہم اُسے اپنی بات سمجھیں۔ انھوں نے کہا ہے:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اُن کی یہ ابیات بھی پڑھنے کی چیز ہیں:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری کا

•

کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی
پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں

•

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

•

پائے پُر آبلہ سے میں گم شدہ گیا ہوں
ہر خار بادیہ کا میرا نشان دے گا

•

یہ بات تو تقریباً سبھی نقادوں نے کہی ہے کہ میرؔ کی غزلوں میں دل اور دلی کے مرثیے ہیں لیکن کسی نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ میر تقی میرؔ جو محسوس کرتے ہیں صرف وہی کہتے ہیں۔ شاعر اگر یہ دیکھنے لگے کہ شعر میں کیسی باتیں پسند کی جائیں گی، شعری نشستوں میں شاعری پر داد کیسے حاصل کی جائے اور نقاد کیسی غزلوں کی تعریف کریں گے تو پھر شاعر اپنی باتوں کی جگہ دوسروں کی باتیں کرنے لگے گا۔ میرؔ نے اپنے کلام میں ایسی مصلحتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی اور تمام بیرونی مطالبات نیز ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر شعر کہے ہیں۔

میر تقی میرؔ کی شاعری کا قصر بلند جذبۂ عشق کے مستحکم ستونوں پر ایستادہ ہے۔ وہ اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کا بیان ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اُن کے کلام کا سحر فی الفور اور تادیر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ اُن کے اشعار میں میرؔ کی داستان عشق بے شمار زاویوں سے نئے نئے لہجوں اور نو بہ نو اسالیب میں سامنے آتی ہے۔ سوز و گداز سے لبریز، خلوص اور اپنائیت کے احساس سے مملو، ابیات میرؔ قاری کے احساس جمال کو تسکین تو پہنچاتی ہی ہیں اُس کے دکھوں پر کافوری مرہم بھی رکھتی ہیں:

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش
اُس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

●

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

●

ہوا مذکور اس کا اور آنسو بہہ چلے رُخ پر
ہمارے کام اکثر دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے

●

یہ بات تو تقریباً سبھی نقادوں نے کہی ہے کہ میرؔ کی غزلوں میں دل اور دلّی کے مرثیے ہیں لیکن کسی نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ میر تقی میرؔ جو محسوس کرتے ہیں صرف وہی کہتے ہیں۔ شاعر اگر یہ دیکھنے لگے کہ شعر میں کیسی باتیں پسند کی جائیں گی، شعری نشستوں میں شاعری پر داد کیسے حاصل کی جائے اور نقاد کیسی غزلوں کی تعریف کریں گے تو پھر شاعر اپنی باتوں کی جگہ دوسروں کی باتیں کرنے لگے گا۔ میرؔ نے اپنے کلام میں ایسی مصلحتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی اور تمام بیرونی مطالبات نیز ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر شعر کہے ہیں۔

میر تقی میرؔ کی شاعری کا قصر بلند جذبۂ عشق کے مستحکم ستونوں پر ایستادہ ہے۔ وہ اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کا بیان ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اُن کے کلام کا سحر فی الفور او. تادیر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ اُن کے اشعار میں میرؔ کی داستان عشق بے شمار زاویوں سے نئے نئے لہجوں اور نو بہ نو اسالیب میں سامنے آتی ہے۔ سوز و گداز سے لبریز، خلوص اور اپنائیت کے احساس سے مملو، ابیات میرؔ قاری کے احساس جمال کو تسکین تو پہنچاتی ہی ہیں اُس کے دکھوں پر کا فوری مرہم بھی رکھتی ہیں:

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش
اُس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

●

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

●

ہوا مذکور اس کا اور آنسو بہہ چلے رخ پر
ہمارے کام اکثر دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے

●

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

محبوب کے دھیان میں مگن رہنا عاشقوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ شاعروں نے، خصوصاً غزل گویوں نے اس موضوع پر کثرت سے طبع آزمائی کی ہے۔ جرأتؔ اور داغؔ وغیرہ نے تو ایسے ایسے زاویوں سے بزم نگار سجائی ہے کہ بیتیرے پاک طینتوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں لیکن استاد الشعراء خدائے سخن میر تقی میرؔ اس میدان میں بھی ممتاز و منفرد نظر آتے ہیں۔ بہت کم عمری میں ہی ان کے صوفی باپ نے عشق کی عظمت کا نقش کچھ ایسی پختگی کے ساتھ موصوف کے ذہن و دل پر مرتسم کر دیا تھا کہ عنفوان شباب میں ہی میرؔ نے ایک پری پیکر سے اتنی والہانہ محبت کی کہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے اور تقریباً تین سال تک مجنونانہ زندگی بسر کی۔ انھیں اس عالم جنوں میں اپنی محبوبہ چاند میں نظر آتی رہی، چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقاش سہل
چاند سارا کھپ گیا تب نیم رُخ صورت ہوئی

کچھ ایسی ہی والہیت اس بیت میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے:

مہ نے آ سامنے کل یاد دلایا تھا اُسے
پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

اور یہ صبح بھی اتنی جلدی اور ایسی آسانی کے ساتھ نہیں آ جاتی۔ اُن ہی کے بقول:

اے شب ہجر راست کہہ تجھ کو
بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

لیکن اُن کی رات اور دن میں کوئی فرق ہو یا نہ ہو، میرؔ کو تو آٹھوں پہر ایک ہی شغل ہے، ذکرِ بتاں۔ اسی رام کہانی میں اُن کے شب و روز گزرتے رہتے ہیں تو ایک بار پھر چلیں تک میرؔ کو سُننے کہ موتی سے پروتے ہیں:

دیکھا کروں تجھی کو، منظور ہے تو یہ ہے
آنکھیں نہ کھولوں تجھ بن، مقدور ہے تو یہ ہے

نزدیک تجھ سے ہے سب، کیا قتل کیا جلانا
ہم غم زدوں سے ملنا اک دور ہے تو یہ ہے

میر تو اپنے محبوب کو مسلسل دیکھتے رہنے کے متمنّی ہیں۔ اُن کے معشوق کا حُسن دلفریب کچھ ایسا ہے کہ

جس جائے سراپا پہ نظر جائے ہے اس کے
آتا ہے یہی جی میں، یہیں عمر بسر ہو

عاشق کو زندہ رکھنا اور قتل کرنا دونوں اُس کے بس میں ہیں لیکن وہ ایسا تغافل شعار ہے کہ اپنے جاں نثاروں سے ہمیشہ اغماز برتتا ہے اس حالت میں میر کا وتیرہ یہ ہے کہ محبوب سامنے نہ ہو تو آنکھیں ہی نہیں کھولتے۔ ہم سب نے محمد حسین آزاد سے سُن رکھا ہے کہ شاہِ اودھ نے میر کی رہائش کا عمدہ بندوبست کر رکھا تھا لیکن وہ اپنے انداز سے نامرادانہ اور بے نیازانہ زیست کرتے رہے اور جب کسی نے محل کے پائیں باغ کی طرف متوجہ کیا تو میر نے کہا اپنے دل کے زخموں اور سینے کے داغوں کی بہار دیکھنے سے فرصت ملے تو باہر نگاہ کروں۔

اپنے محبوب کی بے نیازی اور تغافل شعاری کا احترام جس طرح میر نے کیا ہے اُس کی نظیر نہیں ملتی۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے پاس

معشوق کی محفل میں باریابی ناممکن ہو تب بھی۔

بیٹھے ہی گزری وعدے کی شب وہ نہ آ بھرا
ایذا عجب طرح کی اُٹھائی تمام شب

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا

اور اگر محبوب نے اپنی بزم میں پا کر تلوار کھینچ لی تو:

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں

زیرِ شمشیر ستم میرؔ تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

ایسے مواقع پر پاسِ محبت کے زیرِ اثر میرؔ اپنی پلکیں تک نم نہیں ہونے دیتے:

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

میرؔ کا یہ محبوب عجب سیماب صفت ہے۔ میرؔ اُس کی انجمن میں ہوں تو مختلف طریقوں سے اُن کی استقامت اور جاں سپاری کو آزماتا ہے، طرح طرح کے ظلم ڈھاتا ہے لیکن میرؔ کی غیر حاضری کی بھی اُسے برداشت نہیں، طنزاً پیغام پہنچاتا ہے:

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اور میرؔ کی قسمت یاوری کرتی ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے محبوب کی میرؔ کے رقیب سے اَن بَن ہو جاتی ہے:

بختِ سیہ نے دیر میں کل یاوری سی کی
تھی دشمنوں سے اُس کو لڑائی تمام شب

اس کے ردِ عمل میں محبوب میرؔ کی طرف ملتفت ہوتا ہے لیکن یہاں بھی میرؔ کی خودداری، غیرت اور وفاشعاری رنگ دکھاتی ہے:

وہ تو کس دیر تک دیکھتا ادھر کو رہا
ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دکھایا نہ گیا

ہائے غیوری دل کی اپنے داغ کیا ہے خود سر نے
جی ہی جس کے لیے جاتا ہے اس سے بے پروا ہے دل

لیکن غیرت اور برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے کبھی کبھار میر تقی میرؔ کا پیمانۂ صبر بھی چھلک جاتا ہے کہ محبوب کو آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے سے فرصت ہی نہیں جو میرؔ کا حالِ دل سنے ،لہٰذا گلہ گزار ہوتے ہیں:

تم تو تصویر ہوئے دیکھ کے کچھ آئینہ
اتنی چپ بھی نہیں ہے خوب، کوئی بات کرو

کبھی کہتے ہیں:

دُور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

کبھی محبوب کو احساس دلانا چاہتے ہیں کہ:

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اُجاڑ کے

اور پھر یہ دلچسپ خواہش:

کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے
مدعا ہم کو انتقام سے ہے

اُن کے ہونٹوں پر ہمیشہ یہ دعا رہتی ہے:

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

اکثر اُن کی وفا شعاری اور سچی محبت اثر دکھاتی ہے اور میرؔ کی دعا مقبول ہو جاتی ہے۔
اب میرؔ کس کس زاویے سے اپنے معشوق کو دیکھتے ہیں اور اُس کے حُسن کا پہلو بدل بدل کر پُر تاثیر بیان کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

کِھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

دیکھ کے دست و پائے نگاریں چپکے سے رہ جاویں کیوں
مُنہ بولے ہے یارو گویا مہندی اس کی رچائی ہوئی

کہیں کیا بال تیرے کُھل گئے تھے
کہ جھونکا باد کا کچھ مُشکبو تھا

عطر آگیں ہے بادِ صبح مگر
کُھل گیا پیچ زلف خوشبو کا

گُل ہو، آئینہ ہو، مہتاب ہو، خورشید ہو، میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

پھول، گل، شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں ان میں تمھیں بھائے بہت

گل و آئینہ کیا خورشید و مہہ کیا
جدھر دیکھا اُدھر تیرا ہی رو تھا

اس سیم بدن کو تھی کب تاب و تعب اتنی
وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

جب دردِ دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں
کہتا ہے وہ سُنے ہی، میں خوب جانتا ہوں

ایسے ہزاروں اشعار میرؔ کی غزلوں میں موجود ہیں جن کی روشنی میں اُن کے معشوق کے قد وقامت، غمزہ و ادا نیز میرؔ کے ساتھ اس کے ناز نخروں کی چلتی پھرتی مُنہ بولتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ عالم صرف اُن کی غزلوں کا نہیں ہے اور خاطر نشاں رہے کہ ان غزلوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان سے بھی میرؔ کی طبیعت سیر نہیں ہوتی تو وہ شعلۂ عشق، دریائے عشق اور ایسی ہی درجنوں عشقیہ مثنویوں میں نئے نئے پیرایوں سے ذکر بتاں کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں انھیں اور کسی کام سے دلچسپی ہی نہیں ہے بس ذکرِ محبوب ہے کہ انھیں دن میں آرام کرنے اور رات کو سونے کی مہلت بھی نہیں دیتا۔

میر تقی میرؔ کا محبوب اتنا حسین وجمیل ہے کہ کلیاں اُس کی نیم خواب آنکھوں سے ادھ کھلی رہنے کا ہنر سیکھتی ہیں، اُس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کو شرمندہ کرتے ہیں، اس کی زلف کا ایک پیچ کھل کر بادِ سحر کو عطر آگیں بنا دیتا ہے، وہ ایسا نازک بدن ہے کہ چاندنی میں بھی پگھلتا ہے۔ پھول، آئینہ، چاند، سورج سب کا حُسن اس کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے پھر

میرؔ کے مزاج سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ اُن کا حالِ دل سُنے بغیر جان لیتا ہے۔ اس محبوب کی یاد میں شب و روز غرق رہنے اور اس کی باتیں کرنے میں اپنی نیندیں قربان کر دینے والے میرؔ جب ارشاد فرمائیں:

فرصتِ خواب نہیں ذکرِ بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں

تو زمانے کو ہمہ تن گوش رہنا چاہیے!

• • •

میرؔ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دُور بیٹھا غبارِ میرؔ اُس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

سرخ کبھو ہیں آنسو ہوتے زرد کبھو ہے منہ میرا!
کیا کیا رنگ محبت کے ہیں یہ بھی ایک زمانا ہے

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

عشق نے خوار و ذلیل کیا ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں
سوز و درد و داغ و الم سب جی کو گھیرے پھرتے ہیں

کیا جانیں لوگ عشق کا راز و نیاز میرؔ
اک بات اس سے ہوگئی سو سو بچن کے ساتھ

آپ نے دیکھا کہ میرؔ جی کو عشق نے اتنا با ادب بنا دیا ہے کہ محبت میں خاک ہو جانے کے باوصف اُن کا غبار تک محبوب سے دُور بیٹھتا ہے تا کہ اُسے کوئی پریشانی نہ ہو، وہ محبوب کی شمشیر کے تلے آ کر تڑپنے سے بھی گریز کرتے ہیں کہ محبت تو سر تسلیم تک ہلانے کی اجازت نہیں دیتی، وفورِ عشق میں جن کے چہرے کا رنگ زرد رہتا ہے اور آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں، جنھیں عشق نے اتنا محتاط بنا دیا ہے کہ پلکوں سے آنسو تک نہیں گرنے دیتے۔ محبت میں ہر طرح ذلیل و خوار، اس عاشق کے دل کو سوز، درد، داغ اور الم نے حصار میں لے رکھا ہے جو عشق کے راز و نیاز کا امین ہے اور محبوب کے ساتھ ایک بات بھی کرتا ہے تو اُس کے اخفا رکھنے کے سو سو وعدے کرتا ہے۔

ہر چند کہ اصناف سخن میں غزل اپنی ابتداء سے ہی بطور خاص عشقیہ مضامین کے لیے وقف رہی ہے اور اس کے ہر شاعر نے حُسن و عشق کی واردات اپنے اپنے طور پر بیان کی ہے لیکن میر تقی میرؔ کی مانند کلیتاً عشق کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا کسی بھی غزل گو نے نہیں بنایا۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے میرؔ کی ابیاتِ غزل میں عشق و محبت کی عظمتوں کا بیان کیسے کیسے پیرایوں میں کیا گیا ہے:

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

●

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ وہ لگائی ہے

●

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

●

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار، مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

●

نغمۂ عشق سے ہیں سبحۂ و زنّار ملے
ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

●

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

میرؔ سرتا پا فنافی العشق ہیں اور کیوں نہ ہوں اُن کی عمر مشکل سے پانچ برس کی رہی ہوگی جب سے میرؔ کے شعور ولاشعور میں یہ بات پیوست کی جارہی تھی کہ یہ کائنات دراصل عشق کا کارخانہ ہے اور زندگی محبت کے بنا بے معنی ہے، چنانچہ اُن کے والد کمسنی میں ہی انھیں عشق کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اپنے صوفی منش باپ کی ہدایت کو فرمانبردار بیٹے نے اس طرح گرہ میں باندھا کہ تیرہ چودہ برس کی عمر میں ہی ایک قتالۂ عالم کی محبت میں اتنی شدّت کے ساتھ مبتلا ہوا کہ اُسے جنون ہوگیا۔ چاند میں محبوب کا جمال دل فریب نظر آنے لگا اور وفورِ عشق میں وہ جدھر دیکھتا اُسے اپنے معشوق ہی کا جلوہ دکھائی پڑتا۔ میرؔ کے ان شعروں میں اُن کے عشق کی کیفیت ملاحظہ ہو:

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشان
درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

جب نام ترا لیجیے تب آنکھ بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

آنکھوں سے جو حال پوچھا دل کا
اک بوند ٹپک پڑی لہو کی

میں طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہوں لیکن
سینے میں کوئی دل کو جیسے مَلا کرے ہے

میرؔ نے عشق کے وفور کا پہلو بدل بدل کر بیان صرف اپنے غزلیہ اشعار میں ہی نہیں کیا ہے۔ اُن کی متعدد مثنویوں میں بھی عشق کی عظمت اور اُس کی نیرنگیوں کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ سب جذبۂ محبت سے لبریز ہیں جن سے عشق کی سرشاریاں اور محبت کی گلکاریاں چھلکتی ہیں۔

ان سبھی میں مثنویوں حُسن کا احساس اور محبت کے وفور کا امتزاج لائق دید ہے۔ مثنوی دریائے عشق میں محبت کی عظمت کا قصیدہ کچھ اس طرح قلمبند کیا ہے:

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سر میں جنون ہو کے رہا

واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ
یاں تبسم ہے چشمِ تر کے بیچ

اور 'معاملاتِ عشق' میں حرفِ آخر کے طور پر کہتے ہیں:

کچھ حقیقت نہ پوچھ کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق

عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

میر تقی میرؔ کی شاعری میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں طرح کی جلوہ طرازیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ عشقِ مجازی کے ذیل میں انھوں نے اکثر محبوب کا براہِ راست سراپا نظم کرنے کی بجائے عاشق کے احساسات اور اس کی اُن قلبی کیفیات کو بیان کرنا زیادہ مناسب جانا ہے جو معشوق کو دیکھ کر اُس کے دل پر گزرتے ہیں مثلاً:

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر، میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو مَلا کرے ہے

اور ان کی ایک مثنوی کا یہ شعر دیکھیے:

سراپا پہ جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

دو مختصر سے فقروں میں معشوقِ مجازی کا ایسا بھرپور مرقع پیش کرنا کچھ خدائے سخن ہی کو آتا ہے۔ ہر چند کہ اس بیت میں محبوب کے کسی عضوِ بدن کا ذکر نہیں ہے۔ ویسے میرؔ نے کھُل کر اپنے محبوب کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک لبوں، ادھ کھلی کلیوں جیسی اُس کی نیم خواب آنکھوں، سیمیں ساعدوں، چاند جیسے نیم رُخ نیز رنگِ بدن کی شوخی سے متعلق اور زلفِ مُعطّر کے بارے میں بڑے غضب کے شعر کہہ رکھے ہیں۔ چند ایک آپ بھی سماعت فرمائیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

ساعدِ سیمیں اُس کے ہم نے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

کیا رنگ میں شوخی ہے اس کے تنِ نازک کی
پیراہن اگر پہنے تو اُس پہ بھی تہ بیٹھے

میر تقی میر کی غزلوں کا مرکز و محور عشق کا جذبہ ہے اور اپنی مثنویوں میں بھی انھوں نے تصورِ عشق ہی کی ترجمانی کی ہے۔ اُن کے ہاں عشق ایک بے حد وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ یہ جذبہ عاشق کے دل میں گداختگی اور دل سوزی میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اُن کے عشقیہ اشعار قاری کو احترامِ انسانیت پر آمادہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ محبت ہی انسانی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ میر انسانی اقدار کی برگزیدگی کے لیے عشق کو بطور اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اُسے اشرف المخلوقات کی معراج تصور کرتے ہیں۔ صوفیوں کے ہاں تو عشق اور بھی وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا ہے جہاں عشق کے بغیر زندگی کو وبال سمجھا جاتا ہے اور مادّی زندگی کو معشوقِ حقیقی کے ہجر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عشقِ حقیقی کے تعلق سے میر کی یہ چند ابیات لائقِ سماعت ہیں:

تھا مستعار حسن سے اُس کے، جو نُور تھا
خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا

تری آشنائی سے ہی حد ہوئی
بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں

گُل و آئینہ کیا، خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا ادھر تیرا ہی رُو تھا

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے ذکر سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

الغرض عشق حقیقی اور اس کے متعلقات کے بارے میں میرؔ نے ہزار ہا پرتاثیر اشعار کہے ہیں نیز وحدت الوجود، وحدت الشہود، فنا و بقا، وحدت و کثرت، وجود و عدم، جبر و قدر اور ہستی و نیستی پر گفتگو کی ہے۔ میرؔ کے کلام کی ایک نمایاں انفرادیت یہ بھی ہے کہ پوری غزل کی روایت میں ان جیسا والہانہ عشق کرنے اور خود سپردگی کا جذبہ رکھنے والا عاشق نظر نہیں آتا۔ غزل کے ہر شاعر نے اپنے شعروں میں محبوب کے ظلم و ستم، کج ادائی، بے وفائی اور بے رخی کے خوب خوب گِلے شکوے کیے ہیں حتیٰ کہ معشوق حقیقی سے بھی اقبالؔ کی طرح شکوہ کر بیٹھے ہیں لیکن میرؔ نے اپنے معشوق کی کج ادائیوں اور کم آمیزیوں کو بھی محبت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

آیا مرے بالیں پہ کوئی دم کو وہ لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب کہ دمِ بازپسیں تھا

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے پاس

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا
ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دکھایا نہ گیا

عجب صورتِ حال ہے کہ محبوب نے تمام عمر بے رُخی برتی اور عاشق کو دیکھنے اس وقت پہنچا جب وہ جانکنی کے عالم میں تھا اور میرؔ پھر بھی اس کے احسان مند نظر آ رہے ہیں۔ یہی معاملات پیش کردہ دوسرے اشعار میں بھی نظر آتے ہیں۔ میرؔ کا ایک شعر ہے:

ہم خاک میں ملے سو ملے لیکن اے سپہر
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

بادی النظر میں یہ شعر منتقمانہ جذبے کا حامل نظر آتا ہے لیکن میرؔ کے طریق عشق میں تو محبوب کے بارے میں بُرا سوچنا بھی گناہ ہے۔ وہ دراصل فلکِ ستم گار سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ محبوب کو اُس راہ سے گزرنے کی زحمت دے جس پر میرؔ کی خاک پھیلی ہوئی ہے یہ بھی میرؔ کا ہی شعر ہے:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

عشقِ حقیقی سے متعلق اشعار کے بارے میں تو تاویل ہو سکتی ہے کہ محبوب حقیقی کی مشیت میں کس کو دخل ہے، وہاں راضی بہ رضا رہنا عاشق کی مجبوری ہے۔ لیکن معشوق مجازی کے حضور میرؔ جتنے ادب و احترام سے کام لیتے ہیں اس کی مثال نایاب ہے۔ اس سلسلے کے کچھ اور اشعار پیش کرتا ہوں:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

نامُرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت میں اس آرام طلب کو

محبوب کی دیوار کے تلے عمر گزارنے سے بڑا عیش میر جیسے عاشق کے لیے اور کیا ہوسکتا ہے۔

میر کی ابیات میں گم شدگی کی کیفیت، حیرت زدگی اور ایک نوع کی خوابناک و پراسرار فضا کی جلوہ گری بھی بہت ہے۔ ان پیچیدہ کیفیات کی میر کہیں آئینے، کہیں گرد باد، کہیں جنون، کہیں دشت تو کہیں سائے کے استعارات اور تشبیہات سے تجسیم کاری کرتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پائے پُر آبلہ سے میں گم شدہ گیا ہوں
ہر خار بادیہ کا میرا نشان دے گا

●

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

●

ترے کوچے کے شوقِ طوف میں جیسے بگولہ تھا
بیاباں میں غبارِ میر کی ہم نے زیارت کی

●

اس معنی کے ادراک سے حیرت ہی ہے حاصل
آئینہ نمط صورتِ دیوار رہو تم

●

میں صیدِ رمیدہ ہوں بیابانِ جنوں کا
رہتا ہے مرا موجبِ وحشت مرا سایہ

یہ سچ ہے کہ میرؔ کو زندگی کی بے ثباتی کا شدید احساس ہے:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

دیکھا پلک اُٹھا کے تو پایا نہ کچھ اثر
اے عمر برق جلوہ، گئی تو شتاب کیا

لیکن بے ثباتی کا یہ شدید احساس میرؔ کو قنوطی بناتا ہے نہ انھیں موت سے خوف آتا ہے:

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
بہت اس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

میرؔ کو ناصح سے کوئی دلچسپی ہے نہ وہ خود ناصح بننے کی خواہش رکھتے ہیں البتہ ایک یار غمگسار کی مانند وہ ہمکلامی کے انداز میں قاری کو اپنے بیش قیمت تجربات میں شریک اور کام کی باتوں سے آگاہ کرتے ہیں:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

●

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

●

یہ سرا سونے کی جاگہہ نہیں، بیدار رہو
ہم نے کردی ہے خبر تم کو خبردار رہو

میرؔ کے اشعار کی دل سوزی، حزنیہ کیفیات، المناک فضا، خستگی، ربودگی اور نشتر کی طرح دل میں اُتر جانے کی خاصیت پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ الفاظ کے تخلیقی استعمال پر

انھیں مکمل قدرت حاصل ہے۔ لہجے کی گھلاوٹ اُن کے کلام کا بنیادی وصف ہے۔ اُن کی غزل میں طلسمی کیفیت اور تاثیر کا راز یہ ہے کہ میرؔ نے غمِ ذات کو کائنات سے ہم آہنگ کرلیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اپنی غزل میں جب میرؔ جی کی بھڑاس نکالتے ہیں تو اُن کے اشعار ہر غم زدہ کے زخموں کا مرہم بن جاتے ہیں۔ اُنھیں پڑھتے ہوئے قاری کو ایسی اُنسیت اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے کہ لگتا ہے کوئی دُکھی آدمی دوسرے غمگین آدمی کا دُکھ بٹانے کی کوشش کر رہا ہو، تسلّی دے رہا ہو۔ حسرت ناک جذبات اور المیہ کیفیات کی ترجمانی کا جیسا سلیقہ میرؔ کو آتا ہے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ ہر چند کہ میرؔ اپنے طرزِ بیان میں سلاست اور شائستگی، سادگی اور خلوص کو فوقیت دیتے ہیں اور سہلِ ممتنع کے بادشاہ ہیں پھر بھی اُن کی شاعری میں حیات اور کائنات کے رنگا رنگ مظاہر اور نو بہ نو تجربات کی جلوہ گری نظر آتی ہے اور وہ نازک سے نازک موضوع اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیال اور عمیق ترین احساسات کو بالکل سامنے کی بات بنا دیتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں:

بُوئے گل و رنگِ گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے گر تو بھی چلا چاہے

●

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

●

یک بیاباں بہ رنگِ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

●

آشوبِ بحرِ ہستی کیا جانیے ہے کب سے
موج و حباب اُٹھ کر لگ جاتے ہیں کنارے

●

انھیں مکمل قدرت حاصل ہے۔ لہجے کی گھلاوٹ اُن کے کلام کا بنیادی وصف ہے۔ اُن کی غزل میں طلسمی کیفیت اور تاثیر کا راز یہ ہے کہ میرؔ نے غمِ ذات کو کائنات سے ہم آہنگ کرلیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اپنی غزل میں جب میرؔ، جی کی بھڑاس نکالتے ہیں تو اُن کے اشعار ہر غم زدہ کے زخموں کا مرہم بن جاتے ہیں۔ اُنھیں پڑھتے ہوئے قاری کو ایسی اُنسیت اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے کہ لگتا ہے کوئی دُکھی آدمی دوسرے غمگین آدمی کا دُکھ بٹانے کی کوشش کررہا ہو، تسلّی دے رہا ہو۔ حسرت ناک جذبات اور المیہ کیفیات کی ترجمانی کا جیسا سلیقہ میرؔ کو آتا ہے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ ہر چند کہ میرؔ اپنے طرزِ بیان میں سلاست اور شائستگی، سادگی اور خلوص کو فوقیت دیتے ہیں اور سہلِ ممتنع کے بادشاہ ہیں پھر بھی اُن کی شاعری میں حیات اور کائنات کے رنگا رنگ مظاہر اور نو بہ نو تجربات کی جلوہ گری نظر آتی ہے اور وہ نازک سے نازک موضوع اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیال اور عمیق ترین احساسات کو بالکل سامنے کی بات بنا دیتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں:

بُوئے گُل و رنگِ گُل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے گر تو بھی چلا چاہے

•

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

•

یک بیاباں بہ رنگِ صَوتِ جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

•

آشوبِ بحرِ ہستی کیا جانیے ہے کب سے
مَوج و حباب اُٹھ کر لگ جاتے ہیں کنارے

•

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

●

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

●

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

میؔر کی زبان نرم اور رسیلی ہے ہر چند کہ اُن کے کلام میں فارسی ترکیبوں کی کمی نہیں ہے لیکن ترکیب سازی کا یہ عمل اُن کے تخلیقی تجربات سے ہم آہنگ ہے۔ کلامِ غالبؔ کی طرح میر کے ہاں فارسیت حاوی نہیں ہے۔ میرؔ فارسی کو اردو کے مزاج سے آمیز کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اپنی شاعری میں انھوں نے فارسی کو اردو روز مرّہ سے جتنا قریب رکھا ہے اُن کے ہمعصروں میں بہت کم شاعر اس رمزِ شاعرانہ سے واقف نظر آتے ہیں۔ یہ چند اشعار اس بات کا ثبوت ہیں:

صبح تک شمع سر کو دُھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

●

چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں
سُنا ہوگا کبھی شیون ہمارا

●

کہا میں نے گُل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پہ سوتا تھا
آئی نسیمِ صبح جو ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

●

وہ بندِ قبا کھلے تھے شاید
صد چاک گلوں کا پیرہن ہے

دو مصرعوں کے چھوٹے سے کینوس پر رنگ، خوشبو، نغمگی، نزاکت اور خوش لذتی کے پیکر تراشنا کچھ میرؔ ہی جانتے ہیں۔ حواسِ خمسہ کو اپنے پیکروں سے آسودہ کرنے کی جادوگری میرؔ کی ابیات میں بکثرت نظر آتی ہے مثلاً:

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

●

بلبلوں نے کیا گُل افشاں میرؔ کا مرقد کیا
دُور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

●

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ
عالم آئینے کی مانند درِ باز ہے ایک

●

شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ
جب سوئیے تو چادرِ مہتاب تانیے

میرؔ نے اپنے شاداب تخیّل، رعنائیِ خیال، باطنی اضطراب اور شدّتِ احساس کی مدد سے اردو کی غزلیہ شاعری کو اس کے ابتدائی دور میں ہی بامِ عروج پر پہنچا دیا، غنائی اور

بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پہ سوتا تھا
آئی نسیمِ صبح جو ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

•

وہ بندِ قبا کھلے تھے شاید
صد چاک گلوں کا پیرہن ہے

دو مصرعوں کے چھوٹے سے کینوس پر رنگ، خوشبو، نغمگی، نزاکت اور خوش لذتی کے پیکر تراشنا کچھ میرؔ ہی جانتے ہیں۔ حواسِ خمسہ کو اپنے پیکروں سے آسودہ کرنے کی جادوگری میرؔ کی ابیات میں بکثرت نظر آتی ہے مثلاً:

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

•

بلبلوں نے کیا گل افشاں میرؔ کا مرقد کیا
دُور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

•

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں درآ
عالم آئینے کی مانند درِ باز ہے ایک

•

شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ
جب سوئیے تو چادرِ مہتاب تانیے

میرؔ نے اپنے شاداب تخیل، رعنائیِ خیال، باطنی اضطراب اور شدتِ احساس کی مدد سے اردو کی غزلیہ شاعری کو اس کے ابتدائی دور میں ہی بامِ عروج پر پہنچا دیا، غنائی اور داخلی شاعری میں اس رتبۂ بلند پر تاحال اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکا۔ ان ہی کی

تخلیقی وفور اور اسلوبِ نگارش کی بدولت تاریخ ادب میں ان کا زمانہ اردو غزل کا عہد زریں قرار پایا۔

عشقیہ مضامین ہوں یا متصوفانہ، ایک غیر محسوس اور لطیف طنز کا پٹ دے کر میرؔ اکثر اپنے شعروں میں نشتریت اور چبھن پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں مثلاً:

کن نیندوں سو رہی ہے تو اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا

•

آشفتگی سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھے ہے آگ

•

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

•

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

•

غزل کہنی نہ آتی تھی تو سو سو شعر کہتے تھے
مگر اک شعر بھی اے میرؔ اب مشکل سے ہوتا ہے

•

حال بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

•

دِکھاؤں متاعِ وفا کب اُسے
لگا واں تو رہتا ہے بازار سا

•

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

•

کبھی جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا

•

آٹھوں پہر لگا ہی پھرے ہے تمھارے ساتھ
کچھ ان دنوں میں غیر بہت یار ہو گیا

میرؔ کے کلام میں جو سوز و گداز، حزن و ملال کی کیفیات ہیں، المناک فضا اور حسرت ناکی ہے، ان سب کے پیش نظر کچھ ظاہر بیں نقادوں نے انھیں قنوطی قرار دیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ میرؔ کے وہ شعر بھی جو حُزنیہ کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں، پڑھنے والوں کو مایوسی اور ناکامی کے حصار سے نکال کر زندگی کرنے کا حوصلہ بخشتے ہیں، اُسے احساس دلاتے ہیں کہ اس کارگاہِ حیات میں صرف وہی محرومی اور شکست سے دوچار نہیں ہوا ہے زندگی دراصل دردِ دل سے عبارت ہے اور خلقِ خدا میں اُس جیسے بے شمار زخم رسیدہ اور آفت گزیدہ افراد موجود ہیں جنھیں باہم ایک دوسرے کے غم و اندوہ کو محسوس کرنے اور بے حوصلگی سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حوصلہ مندی، ولولہ، انسانی عظمت کے غمّاز، میرؔ کے مندرجہ ذیل اشعار تو کچھ یہی کہتے ہیں:

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

•

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

●

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ، برق خرمنِ صد کوہِ طور تھا

●

جس کو تم آسمان کہتے ہو
سو دلوں کا غبار ہے اپنا

●

ہنگامۂ قیامت تازہ نہیں، جو ہوگا
ہم اس طرح کے کتنے آشوب کر چکے ہیں

●

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

●

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ وَلے قابلِ دیدار نہ تھا

●

آبِ حیات وہی نا، جس پر خضر و سکندر مرتے تھے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی

میر تقی میرؔ کی کم و بیش دو ہزار غزلوں میں ایسے ہمت افزا، پُر تمکنت، ولولہ انگیز اور مایوسی کی ظلمت کو حوصلے کے نُور سے لبریز کر دینے والے ایک دو نہیں ہزاروں شعر موجود

ہیں۔ بقول کسے، رو لینے کے بعد زندگی جو سنبھالا لیتی ہے، توانائی حاصل کرتی ہے ویسا ہی جادو میر کی غزل میں ہے۔

عشق و محبت کے ذیل میں میر کی ارفع و اعلیٰ شاعری کے ساتھ کم کم ہی سہی ایسی ابیات پر بھی نظر پڑتی ہے جہاں جنس اور جسمانی اختلاط کے بیان میں لذت کوشی کا احساس ہوتا ہے مثلاً:

تھی شب کسی کسائی تیغ کشیدہ کف میں
پر میں نے بھی بغل میں بے اختیار کھینچا

•

کب تلک یوں لوہو پیتے ہاتھ اُٹھا کر جان سے
وہ کمر کولی میں بھر لی ہم نے کل خنجر سمیت

•

ہمبستری میں اس کے میں صاحب فراش ہوں
ہجراں میں کڑھتے کڑھتے ہی بیمار ہو گیا

•

ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن
جیسے جھمکے ہے پڑا گوہر تر پانی میں

•

شب وصل تھی یا شب تیغ تھی
کہ لڑتے ہی دے رات ساری رہے

•

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

•

افلاطونی عشق کی رفعتوں پر نگاہ رکھنے والوں کو، بدن کی جمالیات اور معشوقِ ارضی کی صحبتوں سے فیض یابی کا اعتراف کرنے والی ایسی ابیات میں سطحیت اور ابتذال کے پہلو نظر آتے ہیں لیکن زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے چشم پوشی کرنا تنقید کو زیب نہیں دیتا۔ پھر عشق کو زندگی کا سرچشمہ قرار دینے میں یہ رمز بھی پوشیدہ ہے کہ یہی جذبہ عملی صورت میں نسلِ انسانی کی بقا کا ضامن ہے۔ ان شعروں میں جنسی کثافت کے پہلو بہ پہلو معنی آفرینی اور فکرِ تازہ کی کارفرمائی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور ایک بار پھر میرؔ کے اس کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ روزمرّہ کے معمولی واقعات کو شاعری بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں میر کے ایسے اشعار بھی سامنے آتے ہیں:

میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

•

دلّی کے کج کُلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا

•

اس نوع کے شعروں پر ناک بھوں چڑھانے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اُس زمانے کا عام ذوق اور رجحان تھا جسے معاشرے میں قبولِ عام کا درجہ حاصل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جہاں جنسِ لطیف سے محبت کا اظہار البتہ رمز و کنایہ میں کرنا پڑتا تھا اور پردہ نشینوں سے عشق کا خمیازہ بدنامی و رسوائی کی صورت میں بھگتنا پڑتا تھا۔ پہلے کہہ چکا ہوں کہ کلامِ میرؔ میں عشقیہ اشعار کی بہتات ہے۔ الم ناک اور حزنیہ شعروں سے تو اُن کی پہچان ہی متعین ہوتی ہے۔ بایں ہمہ ولولہ انگیز اور شوخ ابیات کی بھی کلامِ میرؔ میں کمی نہیں ہے:

آ کے میرے مزار پر فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

•

مغ بچوں کے بُرے تھے تیور لیک
شیخ میخانے سے بھلا کھِسکا

•

ستم ہیں قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے
اتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا

•

شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ
ہے پیارے ہنوز دِلّی دُور

•

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

•

ایسے ایسے سیکڑوں شوخ و شنگ شعروں سے ہماری ملاقات میرؔ کے کُلیات میں ہوتی ہے۔ مزید برآں بے شمار سماجی مسائل کلامِ میرؔ میں اُن کے ذاتی تجربات سے آمیز ہو کر نئے نئے جہانِ معنیٰ کی سیر کراتے ہیں۔ میرؔ کے کلام میں عصری حسیّت کی جھلکیاں بھی جا بجا نظر آتی ہیں کہ کوئی بھی فنکار اپنے معاشرے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو کر تخلیقِ فن کر ہی نہیں سکتا۔ فن کو حقیقت کا آئینہ دار ہونا ہی چاہیے۔ میرؔ کے عہد میں دِلّی بار بار لُٹی، بادشاہوں کی آنکھیں دہکتی سلاخوں سے جلائی گئیں اور قتل عام ہوئے، ایسے دل دہلانے والے واقعات کو بھی میرؔ نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور ہر جگہ تخلیقی شان کو برقرار رکھا ہے۔ مثلاً:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا

•

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاک پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

•

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

•

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

•

تو ہے بیچارا گدا میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

•

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر
جینے کا اس سمیں میں اب کیا مزا رہا ہے

•

کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے
ٹکڑے پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے

•

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ اک گھر تھا

•

یہ سچ ہے کہ دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو جانے کے بعد میرؔ کو معاشی اُلجھنوں سے نجات مل گئی تھی اور عمر عزیز کا باقیماندہ حصّہ انھوں نے فارغ البالی میں بسر کیا لیکن لکھنؤ کی جھوٹی

خوشحالی اور پُر تصنع معاشرت میں انھیں سکون اور حقیقی مسرت کبھی نصیب نہ ہو سکی، وہاں رہتے ہوئے انھیں اپنی بے وقعتی اور بے آبروئی کا ہمیشہ خوف رہا۔ اُن کی بے اطمینانی اور لکھنؤ سے ناخوشی کا اظہار میرؔ کے بہت سے اشعار میں نظر آتا ہے، بطور مشتے از خروارے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

لکھنؤ دلّی سے آیا، یاں بھی رہتا ہے اداس
میرؔ کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

•

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزمِ سفر ہنوز

•

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

•

ان بیزار کُن کیفیات اور بے اطمینانی میں میرؔ کے کلام میں مزید بالیدگی اور گہرائی کے امکانات ناپید تھے ہر چند کہ انھوں نے کہا ہے:

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

حقیقت کُچھ یوں ہے کہ میرؔ نے لکھنؤ میں اپنے قیام کے دوران خواہ ریختے کتنی ہی ادا کے ساتھ کہے ہوں، اُن کی عظمت کی ضامن اور سچی بلند پایہ شاعری وہی ہے جو موصوف نے دِلّی کے خرابے میں رہ کر تخلیق کی تھی۔

ہر چند کہ میرؔ اپنے دَور کی پیداوار ہیں اور اُن کے تخلیقی مزاج کی تشکیل اپنے عہد کے انتشار اور ذاتی حالات کے اندوہ کی زائیدہ ہے لیکن اُن کی شاعری کی اپیل عالمگیر بلکہ آفاقی

ہے اور زبان و مکاں کے حصار سے آزاد ہو کر اُس کی تاثیر آج اکیسویں صدی میں بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ملک تک پہنچ رہی ہے۔ نئی نسلوں کے شاعر بطور خاص غزل کہنے والوں کی جتنی اور جیسی رہنمائی میرؔ کا کلام کرتا ہے دوسرے کسی اور شاعر کے یہاں رہنمائی کی وہ قوت نہیں ہے۔ میرؔ ہمیں عام بول چال کی زبان میں مضمر تخلیقی قوت اور ابلاغ کی وسعتوں سے روشناس کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر کہنے کے لیے دُور از کار مضامین اور فلسفیانہ انداز بیان لازمی نہیں ہیں، سامنے کی باتوں میں بھی شاعر اپنے برتاؤ اور احساس کی شدت سے شعریت اور حرارت پیدا کر سکتا ہے اور سادہ اسالیب کے وسیلے سے بھی فلسفیانہ افکار کی گہرائیوں تک پہنچنا ممکن ہے البتہ ان کے لیے تخلیقی اپج اور خلوصِ تخیل کی ضرورت ہے۔ میر تقی میرؔ کی غزل صحیح الفاظ کے استعمال، ان کی بازگشت، تھرتھراہٹ اور نغمگی کی اہمیت سے آشنا کرتی ہے۔ لفظوں کی تکرار اور اصوات کی گونج سے شاعری کتنی معنی خیز اور پر تاثیر بنائی جا سکتی ہے اسے کوئی میرؔ سے سیکھے۔ لہجے کے آہنگ سے استفادہ کرنا اور غنائی اثر پیدا کرنا، نرم اور کرخت الفاظ کے برمحل استعمال پر قدرت حاصل کرنا بھی میرؔ کی غزل سے سیکھا جا سکتا ہے۔ الفاظ کی گھن گرج کے بغیر شاعری میں عظمت کا احساس دلانا بھی میرؔ کا وصف ہے۔

اس بات کو میں نے دیگر کئی مقامات پر یوں کہا ہے کہ غالبؔ اور اقبالؔ نقادوں کے شاعر ہیں اور میرؔ شاعروں کے۔ تنقید کے لیے فلسفہ آرائی اور مضمون آفرینی کی بڑی گنجائشیں کلامِ اقبالؔ اور غزلیاتِ غالبؔ میں موجود ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان شعراء کے ہاں تشبیہات و استعارات کی نادرہ کاری سے ہٹ کر بھی جو ابہام کا اُبھرا ہوا پہلو ہے وہ ناقدین کے لیے اپنی بات کہنے کے بہت سے مواقع فراہم کرتا ہے۔ غالبؔ کے کلام میں ذہین شارح کئی کئی طرح سے اس کی تشریح کر سکتا ہے اور اقبالؔ کے ہاں بھی یہی صورت ہے، چنانچہ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ اقبالؔ اور غالبؔ نے جو باتیں اپنے شعروں میں نہیں کہی ہیں وہ مفاہیم بھی دور کی کوڑی لانے والے نقاد اکثر دوسروں سے ہٹ کر بات کہنے کے شوق میں اپنی تنقید کے

ذریعے غالبؔ اور اقبالؔ کے شعروں میں انڈیل دیتے ہیں ہم میرؔ کے ساتھ یہ عمل روا نہیں رکھ سکتے۔ انھیں تو شعروں کی لفظیات اور میرؔ کے اسالیب کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہی سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے۔ میرؔ کے ہاں اشعار کے مفاہیم اتنے پیوست اور گتھے ہوئے ہوتے ہیں اپنی لفظیات کے ساتھ کہ اپنی پہلوداری کے باوصف تقاضہ یہی کرتے ہیں کہ بیرونی فلسفہ طرازیوں اور موشگافیوں سے بے جا کام نہ لیا جائے۔ میرؔ کی تشریح اُن کے طریقِ اظہار اور دائرۂ فکر کے درمیان رہ کر ہی کی جاسکتی ہے۔ ان کے کلام میں اپنے دل پسند مفاہیم کا پرونا اتنا سہل نہیں ہے جتنا کہ غالبؔ اور اقبالؔ وغیرہ کے اشعار کی اپنی زائیدہ اور خود ساختہ تعبیریں کرنا آسان ہے۔

تلازمات کی پہلو داری اور تشبیہات و استعارات کی ندرت سے میرؔ کے شعروں میں جمالیاتی حُسن اور مفاہیم کی پیچ داری میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اُن کے شعروں میں عصری حسیت کے پہلو بہ پہلو حسیاتی تجسیم کاری اور پیکر تراشی کے خوبصورت نمونے قدم قدم پر دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ روانی، سلاست، نغمگی اور بیساختگی بھی اُن کے اوصافِ کلام میں شامل ہیں۔ علامتوں کا حُسن اور بلاغت کی تہہ داری میرؔ کی اکثر ابیات میں تاثیر اور معنویت کے جادو جگاتی ہے۔ اُن کی قوتِ متخیلہ اور امیجری نے میرؔ کے دیوان کو بھی ایک طرح کے 'اوراقِ مصوّر' کی حیثیت عطا کردی ہے۔ میرؔ نے روز مرّہ کی عوامی زبان کو شاعری کی زبان کے طور پر استعمال کرکے اردو کی کمسنی کے زمانے میں ہی اُسے بلندیوں کی جانب گامزن کردیا۔ میر تقی میرؔ اکثر عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ، نامانوس تراکیب اور دور از کار تشبیہات استعمال کیے بغیر اسی عوامی زبان میں سامنے کی باتوں اور گرے پڑے مضامین میں گہرائی، پہلو داری اور تہہ داری پیدا کردیتے ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی اور معاشرے کے گہرے مشاہدے سے حاصل کردہ بصیرت کے شواہد اہلِ نظر بہ آسانی تلاش کرسکتے ہیں۔ ان میں اس دَور کے تہذیبی اداروں، دربار، بازار اور خانقاہ کے اثرات اور تینوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرؔ کا کلام اپنے دَور کے نشیب و فراز کی عکاسی اور ہمعصر سماج کے مسائل کی ترجمانی بھی کرتا ہے بایں ہمہ اس کی اپیل آفاقی ہے۔

میر تقی میرؔ کی شاعری نرم گفتاری سے عبارت ہے انھیں بلند آہنگی زیادہ پسند نہیں۔ وہ ملائم لب و لہجے کے غزل گو ہیں، صلابت کی جگہ لطافت، گھن گرج اور طنطنے کی جگہ جھنکار، پُرشور روانی کی جگہ مدّھم بہاؤ، احتجاج کی جگہ خودسپردگی اُن کے شاعرانہ لہجے اور طرزِ اظہار کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ انھیں وضاحت اور تفصیل کی جگہ کنایہ اور اجمال پسند ہے۔ میرؔ کے بعد غالبؔ اور اقبالؔ نے اپنی عظمتوں کے پرچم بلند کیے اور آنے والی نسلوں نے وقتاً فوقتاً ان تینوں عظیم فنکاروں سے اثرات قبول کیے لیکن غالبؔ اور اقبالؔ سے متاثر اور ان کے رنگ میں شعر کہنے والے شعراء برگد کے نیچے سر اُٹھانے والے پودوں کی طرح ٹھٹھر کر رہ گئے جب کہ طرزِ میرؔ میں شعر کہنے اور غزل میں اسلوب میرؔ کی پیروی کرنے والوں کو دربارِ ادب میں ممتاز مقامات حاصل ہوئے۔ ابنِ انشاء، ناصر کاظمی، خلیل الرحمان اعظمی بالکل سامنے کی مثالیں ہیں۔ خود میرؔ کے معاصرین میں سوداؔ اور دردؔ جیسے باکمال فنکار موجود تھے لیکن آئندہ نسلوں میں میرؔ کے مقابلے پر ان دونوں کے اثرات مرتسم نہیں ہو سکے۔

غزل کے بعد میرؔ کے کلیات میں سب سے زیادہ جس صنفِ سخن پر توجہ صرف ہوئی ہے وہ مثنوی ہے۔ اُن کے کلیات میں کم و بیش 37 مثنویاں ہیں جن میں نو عشقیہ، تیرہ واقعاتی، تین مدحیہ اور بارہ ہجویہ مثنویاں ہیں۔ اُن کی مثنویوں، خصوصاً عاشقانہ مثنویوں میں تغزل کا رنگ گہرا ہے جسے کچھ نقاد اُن کا وصف اور کچھ اُن کی کمزوری قرار دیتے ہیں۔ عشقیہ مثنویوں میں سے چند میں میرؔ نے اپنے اوپر گزرنے والی واردات عشق کو موضوع بنایا ہے اور تقریباً چھ مثنویاں جگ بیتی کا بیانیہ ہیں لیکن اُن میں بھی میرؔ کی شخصیت جگہ بہ جگہ جھلکتی ہے۔ ان مثنویات میں، جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں لکھ آیا ہوں، میرؔ کے جذبۂ عشق کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ میر اپنی غزلوں کی طرح ان مثنویوں میں بھی بار بار اور پوری شدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ عشق زندگی کا جوہر اور انسانیت کی سب سے اہم پہچان ہے اور اسی ابدی جذبے کے دم قدم سے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ زیادہ تر عشقیہ مثنویوں میں میرؔ نے اپنے عہد کے زباں زدِ عام معروف قصوں کو بنیادی مآخذ کی حیثیت سے برتا ہے

چنانچہ کچھ ناقدین انھیں منظوم داستانیں قرار دیتے ہیں۔ بعض مثنویوں میں پیش کردہ بعید از فہم اور مافوق الفطرت واقعات کو بھی میرؔ نے ایسی چابکدستی اور تخلیقی طرز میں بیان کیا ہے کہ وہ قاری کو قرینِ قیاس محسوس ہونے لگتے ہیں۔ میر تقی میرؔ اپنی مثنویوں کا آغاز مثنوی نگاروں کی طرح رائج العام طریقۂ کار یعنی حمد و نعت سے نہیں کرتے بلکہ اُن کی مثنویاں (بہ استثنائے 'اعجازِ عشق') جذبۂ محبت کی عظمت، اس کی ہمہ گیری اور حیات و کائنات میں عشق کی شوریدگی کے بیان سے شروع ہوتی ہیں جن سے قاری پر منکشف ہوتا ہے کہ خالق و مخلوق کے رشتے اور کائنات کے نظام کا محور صرف اور صرف عشق کا جذبہ ہے۔

میرؔ کی واقعاتی مثنویاں اس دور میں شاعر کی اپنے گردوپیش کی خارجی زندگی سے دلچسپی کے شواہد فراہم کرتی ہیں۔ کہیں آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے کے مناظر ہیں تو کہیں مرغ بازوں کی دلچسپ نوک جھونک، کسی میں جنگ کا نقشہ کھینچا گیا ہے تو کہیں شادی کی گہما گہمی نظر آتی ہے۔ کچھ مثنویوں میں پالتو جانوروں کو موضوع قرار دیا گیا ہے تو کہیں نوابِ اودھ کے ہمراہ میرؔ جنگل میں شکار کھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔ القصہ واقعاتی مثنویوں میں میرؔ نے ایک جہانِ دیگر اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے تلاش کرلیا ہے جن میں دشت وصحرا کی منظرکشی، جانوروں کی حرکات وسکنات اور زندگی کی مختلف النوع جولانیوں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ شکارناموں سے متعلق مثنویوں میں میرؔ نے اپنی متعدد غزلیں شامل کی ہیں۔ ایک آدھ مقام پر رباعی بھی پرودی ہے جس کی وجہ سے یہ نگارشات قدرے ناہمواری ہوگئی ہیں۔ بہرطور ان مثنویوں میں پیش کردہ خارجی دنیا کے حسین مناظر ایک منفرد ذائقے کے حامل ہیں اور میرؔ کی شاعرانہ خلاقی کا احساس دِلاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے میرؔ کی شخصیت کے بہت سے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جنھیں غزل کی رمزیت اور اشاریت نے چھپا رکھا تھا۔

اُن کی مثنویات میں بطور خاص ''دریائے عشق''، ''معاملات عشق''، ''خواب و خیال''، ''شعلۂ عشق''، ''جوشِ عشق''، وغیرہ لائقِ ذکر ہیں۔ ان مثنویوں نے اکثر ناقدین کو مابعد الطبعیاتی جمالیات کا احساس دلایا ہے اور میرؔ نے ان میں اپنے زورِ قلم سے مافوق الفطرت

واقعات کو ایسے فطری انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ حقیقت کا التباس پیدا کرتے ہیں۔ بہ استثنائے چندان مثنویوں کا اساسی موضوع عشق کا بے پناہ جذبہ ہے اور ان کی فضا کچھ ایسی پراسرار ہے کہ قاری کو تادیر اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ ان میں تغزل کی چاشنی بھی ہے اور میرؔ کی موتی سی پرونے والی وہ دلکش عام فہم زبان بھی، جن سے اُن کی غزلیں متصف ہیں۔ حزن والم کی وہ فضا بندی جسے غزلیہ شاعری میں میرؔ نے اکثر استعمال کیا ہے، ان مثنویوں میں بھی جاری و ساری ہے، سوز وگداز پر مشتمل جذبات نگاری اور والہانہ سرمستی بھی مثنویاتِ میرؔ کے بنیادی اوصاف ہیں۔ اُن کی مثنوی ''خواب و خیال'' کا ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا
بندھا اس طرح آہ بارِ سفر
کرے زادِ رہ کچھ نہ بارِ سفر
گرفتار رنج و مصیبت رہا
غریبِ دیارِ محبت رہا
چلا اکبرآباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشمِ حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیوں کر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
دلِ مضطرب اشکِ حسرت ہوا
جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
پس از قطعِ رہ لائے دِلّی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر دورِ گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہو گیا

میؔر کے کلیات میں اٹھارہ مختصر ہجویہ مثنویاں بھی شامل ہیں جن میں کہیں اپنے شکستہ مکان کی مذمت کی گئی ہے تو کہیں اپنے کسی ہمعصر شاعر کی۔ کسی میں اس عہد کے کسی صاحب ثروت کے بداعمال کو نشانۂ ملازمت بنایا گیا ہے تو کہیں پورے معاشرے کی ہجو کی گئی ہے۔ ''اجگر نامہ'' میں میؔر نے اپنے عہد کے شاعروں کو تختۂ مشق بنایا اور اپنی عظمت کا ترانہ خود الاپا ہے:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ان مثنویوں سے اس معاشرے کے انحطاط، اخلاقی پستی اور بدحالی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جس میں میؔر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان سے میؔر کی جس مزاح کا بھی ثبوت ملتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہر حال ہمارا یہ عظیم شاعر اور صوفی منش انسان بھی بشری خامیوں کا حامل تھا اور مُنتقمانہ جذبے کے تحت بھی شعر کہہ سکتا تھا۔

رثائی شاعری میں بھی میؔر نے دادِ سُخن دی ہے۔ ان کے مرثیے کلیات میں بھی ہیں اور علیحدہ بھی مجموعے کی شکل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ حُزن اور حسرت ناکی تو میؔر کی غزلوں میں عروج کو پہنچی ہوئی ہے۔ مرثیے اس خاص میدان میں بڑی گنجائش رکھتے ہیں، چنانچہ مراثیِ میؔر میں رخصت اور بین کے اجزاء بطورِ خاص بڑے زور دار ہیں اور تاثیر سے لبریز ہیں۔ ایک رخصت کا منظر دیکھیے:

وقتِ رخصت کہ جو روتی تھی کھڑی زار بہن
بولے شبہ روؤ نہ بس اے مری غم خوار بہن
کیا کروں جان کے دینے میں ہوں لاچار بہن
اب رہا روز قیامت ہی پہ دیدار بہن

میرؔ نے 34 مرثیے کہے ہیں جن میں سے تین مسدس کے فارم میں، تین غزل کی ہیئت میں اور بقیہ مربع کے فارم میں ہیں۔ خاطر نشاں رہے کہ عہد میرؔ تک نہ تو مرثیے کی مخصوص ہیئت (مسدس) کا تعین ہوا تھا نہ ہی اس کے آٹھ اجزائے ترکیبی متعین ہوئے تھے۔ آگے چل کر مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں رخصت اور بین کی شمولیت میں مراثیِ میرؔ کا کچھ ہاتھ ضرور ہے۔ اٹھارویں صدی میں عزاداری کے طور طریق سے ہماری واقفیت کا ایک معتبر وسیلہ میرؔ کے مرثیے بھی ہیں بہ ایں ہمہ میرؔ کے مرثیے اُن کی غزل یا مثنوی کے مقابلے پر نہیں رکھے جاسکتے، ان کی تاریخی اہمیت سے البتہ انکار نہیں کیا جاسکتا۔

میرؔ کے ادبی خزانے میں آٹھ قصیدے بھی موجود ہیں جن میں سے چار بزرگانِ دین کی شان میں اور چار حکمرانِ وقت کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ قصیدے میں میرؔ کا لہجہ اُتنا ہموار اور رواں دواں نہیں ہے جیسا کہ مثنویوں میں ہے۔ ہر چند کہ ان قصیدوں میں فنی خوبیاں اور زبان و بیان کے محاسن کو تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ میرؔ کے ترکش کے ایسے ناوک ہیں جو زیادہ دُور مار نہیں ہیں۔

مطالعۂ میرؔ کے دوران اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ میرؔ کے زمانے میں اردو زبان اپنے تشکیلی اور تعمیری دور میں تھی اور اسے تشکیل دینے اور تعمیر کرنے میں خود میرؔ کا بھی بڑا ہاتھ ہے جب کہ غالبؔ اور اقبالؔ کی عظمت کے پسِ پشت اس ترقی یافتہ اور جوانی کی منزل کو پہنچی ہوئی اردو کا ہاتھ ہے جو انھیں میرؔ کے کافی عرصے بعد نصیب ہوئی تھی اور یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ میرؔ کو تقلید کے لیے اپنے عہد میں یا اس سے پہلے کسی عظیم اردو شاعر کی مثال دستیاب نہیں تھی جب کہ غالبؔ کو میرؔ اور اقبالؔ کو غالبؔ و میرؔ جیسے دو دو قد آور نمونے رہبری کے لیے دستیاب تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میرؔ کے متعلق کچھ ممتاز نقادوں کی آراء اور خیالات بھی آپ کے مطالعے کے لیے پیش کر دیے جائیں:

فراقؔ گورکھپوری

''میرؔ مجسم پیار تھے، صرف محبوب کے لیے نہیں بلکہ کائنات کے ذرّے ذرّے کے لیے۔ میرؔ زندگی اور کائنات سے بیزار نہیں ہیں۔ جب وہ اس بیزاری کا رونا روتے ہیں، اس وقت بھی ناقدانہ شعور یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ میرؔ حیات اور کائنات کو اپنے سینے میں بھینچے ہوئے تھے، یہی پیار اور چمکار اس سوز و گداز کا راز ہے جس میں کوئی بھی اردو شاعر میرؔ کو نہیں پاسکا...... میرؔ کے ہاں قدرِ اوّل کے اشعار کی تعداد غالباً ڈھائی تین سو یا اس سے کچھ کم یا زیادہ تک پہنچتی ہے۔ لیکن میرؔ کے نہایت اچھے اشعار کی تعداد تین ہزار سے کم نہیں ہے...... میرؔ کی شاعری میں لہجے کا دھیماپن ہے جس سے حیات و کائنات کی عظمت، رعب و جلال کا اندازہ ہمیں میرؔ کراتے ہیں...... میرؔ کے لہجے کی نرمی دنیا کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ میرؔ کے کلام کی سب سے بڑی اور سب سے اہم حقیقت یا محرک میرؔ کا خلوصِ تخیّل ہے۔ غنائی شاعری میں یہ خلوصِ تخیّل دنیا کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے اور یہی وہ مرکز سوز و ساز ہے جہاں خود الفاظ کے پر جلنے لگتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری میں ہم سکوتِ سرمدی کے دل کی دھڑکنیں سنتے ہیں۔''

پروفیسر شکیل الرحمان

''میرؔ شرنگاررس کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ عشق ہی شرنگاررس کا مرکز ہے...... میرؔ کی شاعری عشق کے جذبے کی ایک ایسی شاعری ہے کہ ٹھٹک کر دیکھتے رہنے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہاں شرنگاررس کی تازگی لیے جو اشعار آئے ہیں وہ قابلِ توجہ ہیں اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے اور یادوں کو سمیٹتے ہوئے میرؔ کا احساسِ جمال بھی متاثر کرتا ہے اور اُن کی رومانیت بھی اثر انداز ہوتی ہے۔''

محمد حسن عسکری

''میر کو یوں تو حسرت و یاس کا شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن پھر بھی یہ کہیں محسوس نہیں ہوتا، کم سے کم اچھے شعروں میں، کہ اگر انھیں غم ہے تو ساری دنیا کو غم میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ وہ زندگی کو لازمی طور پر اپنا دشمن سمجھتے ہیں جس نے چھانٹ کر انھیں اپنا شکار بنایا ہو۔ انھیں اپنی ناکامیوں پر رنج سہی لیکن وہ اس رنج کو کائنات پر مسلط نہیں کرنا چاہتے۔ وہ صرف اتنی ہمدردی کے طالب ہیں جتنی ایک انسان دوسرے انسان کو دے سکتا ہے ...... محبوب کی بے اعتنائی کو بھی میر ہمیشہ سخت دلی یا ظلم یا فطری بدکرداری نہیں سمجھتے۔ اُن کے بہترین شعروں میں محبوب بھی انسان ہوتا ہے اور اس کی وہی خصوصیات ہوتی ہیں جو اور انسانوں کی۔''

آل احمد سرور

''میر نے شاعری کو جو لب و لہجہ دیا ہے اور صلابت کے بجائے لطافت پر توجہ، آواز میں گونج اور گرج کے بجائے نرمی پر اصرار، جذبات کے تند و تیز بہاؤ کے بجائے ضبطِ فغاں اور سازِ زیر لبی پر جو زور دیا ہے وہ بڑی بھرپور اور مستقل کیفیت رکھنے والی شاعری کا ہے ...... میر کے زمانے میں سیاسی انتشار، بدامنی اور تاراج نے صراحت کے بجائے کنائے اور وضاحت کے بجائے اشارے میں پناہ لی ...... میر نے تغزل کو جو آداب سکھائے ہیں انھیں کسی زمانے میں ترک نہیں کیا جاسکتا اور کسی نہ کسی وقت میر سے آدابِ فن سیکھنے کے لیے ہر ایک کو اُن کے در پر آنا پڑتا ہے۔ غالب بھی ساری دنیا کی سیر کرکے میر تک پہنچے ...... ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے بعد دل کی جراحتوں کے جو چمن کھلائے گئے اُن میں میر کا رنگ فطری طور پر آیا اور

جب تک غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا نشترِ سرتیز موجود ہے، میرؔ کا ہنر بھی زندہ ہے۔ جدید شاعری میں سرگوشی کی جو کیفیت ہے وہ بھی میرؔ کے سازِ زیرِ لبی کی آواز بازگشت ہے۔''

جمیل جالبی

''میرؔ نے اپنی تخلیقی قوت سے اس دَور کے غم والم کو اپنی شاعری میں سمو کر نہ صرف اس کی ترجمانی کی بلکہ تزکیہ (کتھارسس) کر کے اس پر فتح بھی حاصل کر لی۔ اُن کی شاعری غموں کو ہضم کر کے نہ صرف انھیں ایک مثبت صورت دے دیتی ہے بلکہ انسان کو غم ونشاط کی کیفیت سے بلند تر بھی کر دیتی ہے۔ میرؔ کے غم میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ انسان کی نشتریت ہمارے اندر حیات و کائنات کے نئے رشتوں کا شعور پیدا کر کے ہمیں بیدار کر دیتی ہے۔ میرؔ نے غم والم کو زندگی کے تعلق سے دیکھا اور انھیں عام انسانی جذبات میں تلاش کر کے اجتماعی احساس کا حصّہ بنا دیا۔ میرؔ کی شاعری ہمیں اقبالؔ کی طرح رجائیت کا براہِ راست پیغام نہیں دیتی بلکہ بحیثیت مجموعی اس کا اثر مثبت ہے۔''

رشید احمد صدیقی

''میرؔ کی اردو، دوسرے شعراء کی اردو سے اس اعتبار سے علیٰحدہ اور اہم ہے کہ دوسرے شعراء اکثر و بیشتر عربی، فارسی اور دوسری زبانوں کے الفاظ، تراکیب، بندش، محاورہ، روز مرّہ یا انواع و اقسام کے علوم وفنون یا نعروں کے سہارے چلتے ہیں، میرؔ صرف اردو اور اپنے مخصوص لب ولہجہ سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے ممتاز شعراء کی جو مخصوص زبان ہوتی ہے اس میں اتنی 'اُردوئیت' یا 'اردو پن' نہیں ہوتا جتنا میرؔ کے یہاں ہے۔ میرؔ نے ہر

طرح کی بات اور ہر شاعر کی بات اپنی خاص زبان اور مخصوص لہجے میں ادا کر دی ہے۔''

شمس الرحمان فاروقی

''میر کے خراب شعر بھی، ہیں تو میر ہی کی طرح کے ہیں مثلاً میر کے یہاں ڈھیلی ست بندش والا شعر ایک نہ ملے گا نہ ہی میر کے پورے کلیات میں آپ کو دولخت شعر ملے گا نہ ایسا شعر ملے گا جس میں ایک مصرع بہت عمدہ اور دوسرا پھسپھسا ہو۔ اس طرح بھرتی کے الفاظ میر کے اکا دکا شعر (خاص کر غزل کے شعر) میں ملیں تو ملیں، اس کے لیے آپ کو بہت کاوش کرنی ہوگی۔ میر کے یہاں آپ کو کمزور یا نامناسب استعارے اور تشبیہیں نہیں ملیں گی اور ٹھس، یا روانی سے عاری، بلکہ کم روانی والا شعر تو میر کے یہاں آپ کو ساری عمر کی تلاش کے بعد بھی نہ ملے گا۔''

گوپی چند نارنگ

''شروع ہی سے میر کا مزاج اپنے پیش رووں سے بالکل مختلف تھا۔ اُن کا جوہر ذاتی اس نوع کا تھا اور تخلیقی اپج ایسی زبردست تھی کہ شروع جوانی سے ہی میر اپنے عہد کے مزاج سے ہٹ کر شعر کہہ سکتے تھے ...... متعدد اسلوبیاتی امتیازات کے باعث میر کا لہجہ ایسی شدید انفرادیت رکھتا ہے کہ میر کا شعر پڑھتے یا سنتے ہی فوراً محسوس ہوتا ہے کہ یہ لہجہ دوسروں سے الگ ہے...... میر کا آرٹ فریب نظر کی کیفیت رکھتا ہے۔ اس کا کمال یہی ہے کہ اس آرٹ پر آرٹ کا شائبہ نہیں ہوتا یعنی سادگی کے ساتھ میر کی پُرکاری اس درجہ تہہ نشیں کہ بظاہر سادہ ہی سادہ معلوم ہوتی ہے ...... میر اردو کے پہلے

بڑے شاعر ہیں جن کے یہاں اردو کی جتنی شانیں، جتنے ذیلی اسالیب، جتنی لسانی جہات ملتی ہیں اُتنی بعد کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔"

حامدی کاشمیری

"بعض لوگ میرؔ کی سہل پسندی کے اتنے رطب اللسان ہیں کہ ان کی سہل ممتنع کے ذیل میں آنے والی غزلوں کو بھی ان کی سہل پسندی کا ثبوت قرار دیتے ہیں ...... ایک اچھا شعر زبان کی سادگی اور روانی کے باوجود ابہام اور معنوی تہہ داری کا حامل ہوتا ہے ...... میرؔ کی سہل ممتنع کے ذیل میں آنے والی شاعری کو سادہ، یک رنگ یا سریع الفہم قرار دینا درست نہیں نہ ہی ان سے ان کی سہل پسندی مترشح ہوتی ہے۔ ایسے اشعار میں سادہ الفاظ میں معیّن یا معروف مطالب ادا نہیں کیے گئے ہیں بلکہ انوکھے اور پیچیدہ تجربوں کا اظہار کیا گیا ہے۔"

• • •

انتخابِ کلام

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا
(میرؔ)

(1)

تھا مستعار حُسن سے اس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر — کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ، بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(2)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رخسار پری کا — چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبکِ دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت — اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا — انصاف طلب ہے تری بے داد گری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو — آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے — مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو — ٹکڑا ہے مرا اشک عقیقِ جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر — تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

(3)

کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا

کس رات نظر کی ہے سوئے چشمکِ انجم
آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہِ جبیں تھا

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ باز پسیں تھا

شب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا، سو کہے تو، کہ وہیں تھا

جانا نہیں کچھ، جز غزل آ کر کے جہاں میں
کل میرے تصرّف میں یہی قطعہ زمیں تھا

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خراباتِ نشیں تھا

(4)

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اُس کی، خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جُبہ، خرقہ، کُرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اُس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھُولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

(5)

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا ۔۔۔ رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
طائرِ رنگِ حنا کی ہی طرح ۔۔۔ دل نہ اس کے ہاتھ سے چھوٹا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور ۔۔۔ اب کہاں وہ آئینہ، ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے ۔۔۔ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میرؔ کس کو اب دماغِ گفتگو
عمر گزری ریختہ چھوٹا گیا

(6)

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا ۔۔۔ چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا
امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے ۔۔۔ آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل ۔۔۔ اے چشم جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا
تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میرؔ پر
کیا جانیے کہ حالِ نہایت کو کیا ہوا

(7)

شب ہجر میں کم تظلم کیا کہ ہمسایگاں پر ترحم کیا
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات؟ کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
زمانے نے مجھ جرعہ کش کو ندان کیا خاک و خشت سرِ خم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک پلک تک گیا تو تلاطم کیا
کسو وقت پاتے نہیں گھر اُسے
بہت میرؔ نے آپ کو گم کیا

(8)

نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا شاعری تو شعار ہے اپنا
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا
کچھ نہیں ہم مثالِ عنقا لیک شہر شہر اشتہار ہے اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو سو دلوں کا غبار ہے اپنا

(9)

دل میں بھرا زبسکہ خیال شراب تھا مانند آئینے کے مرے گھر میں آب تھا
اُگتے تھے دست بلبل و دامانِ گل بہم صحن چمن نمونۂ یوم الحساب تھا
ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا
دل جو نہ تھا تو رات زخود رفتگی میں میرؔ
گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

(10)

جب جنوں سے ہمیں توسّل تھا — اپنی زنجیرِ پا ہی کا غُل تھا
یک نگہ کو وفا نہ کی گویا — موسم گُل سفیرِ بلبل تھا
اُن نے پہچان کر ہمیں مارا — منھ نہ کرنا اِدھر تجاہل تھا
شہر میں جو نظر پڑا اس کا — کشتۂ ناز یا تغافل تھا
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار — یادِ ایّام جب تحمّل تھا
یوں گئی قد کے خم ہوئے جیسے — عمر اک رہرو سرِ پُل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقتِ خوش میرؔ نکہتِ گُل تھا

(11)

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا — عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے — چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
آنکھیں چرائیو نہ ٹک ابرِ بہار سے — میری طرف بھی دیدۂ خوں بار دیکھنا
ہونا نہ چار چشم، دل اس ظلم پیشہ سے — ہشیار زینہار خبردار دیکھنا
صیاد دل ہے داغِ جدائی سے رشکِ باغ — تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا
گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر — اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا
شاید ہماری خاک سے کچھ ہو بھی اے نسیم — غربال کرکے کوچۂ دلدار دیکھنا

اس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کجو میرؔ
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

(12)

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا ... تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں ... جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح ... تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں ... کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے ... جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے ... ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

(13)

اُس گُل زمیں سے اب تک اُگتے ہیں سرو جس جا ... مستی میں جھکتے جس پر تیرا پڑا ہے سایا

یکساں ہے قتل گہہ اور اُس کی گلی تو مجھ کو ... واں خاک میں میں لوٹا یاں لوہو میں نہایا

پُوجے سے اور پتھر ہوتے ہیں یہ صنم تو ... اب کس طرح اطاعت ان کی کروں خدایا

آخر کو مر گئے ہیں اس کی ہی جستجو میں ... جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اُسے نہ پایا

ہوتا تھا مجلس آرا گر غیر کا تجھے تو ... مانندِ شمع مجھ کو کاہے کے تئیں جلایا

(14)

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا ... دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے ... نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

مزا دکھا دیں گے بے رحمی کا تری صیاد ... گر اضطراب اسیری نے زیرِ دام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں ... تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ ... پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

(15)

گُل شرم سے بہہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
بُرقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا

گل برگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعلِ ناب سا

دل تاب ہی لایا نہ ٹک، تا یاد رہتا ہم نشیں
اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا

سنّا ہٹے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا
اسباب سارا لے گیا آیا تھا اک سیلاب سا

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اُٹھی کبھو
اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا

(16)

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

پیدا ہے کہ پنہاں تھی آتش نفسی میری
میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا

میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا ورنہ
اک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا

بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو
پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا

وہ سیر کا وادی کے مائل نہ ہوا ورنہ
آنکھوں کو غزالوں کی پانو تلے مل جاتا

بے تاب و تواں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا
یاقوتی ترے لب کی، ملتی تو سنبھل جاتا

اس سیم بدن کو تھی کب تابِ تعب اتنی
وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

(17)

گل کو محبوب ہم قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن
شوق نے ہم کو بے حواس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

(18)

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا
غافل نہ رہ کہ قافلہ اک بار جائے گا

چھوٹا جو میں قفس سے تو سب نے مجھے کہا
بے چارہ کیونکہ تا سر دیوار جائے گا

تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب
اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا

آئے بن اس کے حال ہوا جائے ہے تغیر
کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

(19)

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہوگیا
قافلہ جاتا رہا مجھ صبح ہوتے سو گیا

بے بسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

کچھ خطرنا کی طریق عشق میں پنہاں نہیں
کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہو کر جو گیا

مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں
ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

میر ہر اک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ
جب سے وہ دریا پہ آکر بال اپنے دھو گیا

(20)

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

(21)

کئی دن سلوک وداع کا، مرے در پئے دلِ زار تھا
کبھو درد تھا، کبھو داغ تھا، کبھو زخم تھا، کبھو وار تھا

دمِ صبح بزمِ خوش جہاں، شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دلِ خستہ جو لوہو ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا، کبھو درد و غم سے فگار تھا

دلِ مضطرب سے گزر گئی، شب وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا نہ قرار تھا

یہ تمھاری ان دنوں دوستاں، مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں، کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

کبھو جائے گی جو اُدھر صبا، تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا، ترے باغ تازہ میں خار تھا

(22)

مہر کی تجھ سے توقّع تھی ستم گر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بے تاب
کس کی تسکیں کے لیے گھر سے تو باہر نکلا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

کنج کاوی جو کی سینے کی غم ہجراں نے
اس دفینے میں سے اقسام جواہر نکلا

(23)

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا
اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا

ہم رہروانِ راہِ فنا ہیں برنگِ عمر
جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہُوا ہے چاک پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
ہم بے خودانِ محفلِ تصویر اب گئے آئندہ ہم سے آپ میں آیا نہ جائے گا
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

(24)

موا میں سجدے میں پر نقش میرا بار رہا اُس آستاں پہ مری خاک سے غبار رہا
کبھو نہ آنکھوں میں آیا وہ شوخ خواب کی طرح تمام عمر ہمیں اس کا انتظار رہا
بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا ق
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہہ نکلا رہا جو سینۂ سوزاں میں داغ دار رہا
سو اُس کو ہم سے فراموش کاریوں لے گئے کہ اس سے قطرۂ خوں بھی نہ یادگار رہا

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

(25)

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے جستجو کی پہ دل گمشدہ پایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اُسے پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

زیرِ شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

(26)

ادھر آ کر شکار افگن ہمارا مشبک کر گیا ہے تن ہمارا
گئے جوں شمع اس مجلس میں جتنے سبھوں پر حال ہے روشن ہمارا

ہوا رونے سے رازِ دوستی فاش　　ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا

چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں　　سُنا ہوگا کبھو شیون ہمارا

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا　　سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

(27)

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا　　پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا　　نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تُو تھا

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ　　کہ ہر غنچہ دل پُر آرزو تھا

گُل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا　　جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رُو تھا

کہیں کیا بال تیرے کھل گئے تھے　　کہ جھونکا باؤ کا کچھ مشک بُو تھا

نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن　　غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

(28)

راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے　　یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمین　　تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں　　داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

(29)

کیا جانوں بزمِ عیش، کہ ساقی کی چشم دیکھ　　میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

جس دم کہ تیغِ عشق کھنچی بوالہوس کہاں　　سن لیجیو کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا

ہے کون آپ میں جو ملے تجھ سے مستِ ناز — ذوق خبر ہی نے تو ہمیں بے خبر کیا

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن — سُن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

چاروں طرف ہیں خیمے کھڑے گردباد کے

کیا جانیے جنوں نے ارادہ کدھر کیا

(30)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — ہر سخن تا بلب نہیں آتا

دُور بیٹھا غبارِ میر اُس سے

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

(31)

بارہا گور دل جھکا لایا — اب کے شرطِ وفا بجا لایا

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل — سارے عالم میں میں دکھا لایا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

دل مجھے اُس گلی میں لے جا کر — اور بھی خاک میں ملا لایا

ابتداء ہی میں مر گئے سب یار — عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(32)

کب تک یہ ستم اُٹھایئے گا　　ایک دن یوں ہی جی سے جایئے گا
شکل تصویر بے خودی کب تک　　کسو دن آپ میں بھی آیئے گا
سب سے مل چل کہ حادثے سے پھر　　کہیں ڈھونڈا بھی تو نہ پایئے گا
کہیے گا اُس سے قصّۂ مجنوں　　یعنی پردے میں غم سنایئے گا

اس کے پا بوس کی توقع پر
اپنے تئیں خاک میں ملایئے گا

(33)

پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا
اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رو چکا
لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں
آنکھیں اگر یہیں ہیں تو بھر نیند سو چکا
یک چشمک پیالہ ہے ساقی بہارِ عمر
جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا
ممکن نہیں کہ غم کرے ویسی شگفتگی
اس سرزمیں میں تخمِ محبت میں بو چکا
ہر صبح حادثے سے یہ کہتا ہے آسماں
دے جامِ خون میرؔ کو گر منھ وہ دھو چکا

(34)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا　　دل کے جانے کا نہایت غم رہا
دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک　　قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمے کو سیاہ   اُس میں مجنوں کا گھر ماتم رہا
اُس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے   اپنے حق میں آبِ حیواں سَم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی   ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

(35)

اُس چہرے کی خوبی سے عبث گُل کو جتایا
یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا
کچھ ماہ میں اس میں نہ تفاوت ہوا ظاہر
سو بار نکالا اُسے اور اُس کو چھپایا
یہ باغ رہا ہم سے و لے جا نہ سکے ہم
بے بال و پری نے بھی ہمیں خوب اُڑایا
میں صیدِ رمیدہ ہوں بیابانِ جنوں کا
رہتا ہے مرا موجبِ وحشت مرا سایا
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

(36)

جھمکے دکھا کے طور کو جن نے جلادیا   آئی قیامت ان نے جو پردہ اُٹھا دیا
اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر   گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا
جانی نہ قدر اس گہرِ شب چراغ کی   دل ریزۂ خزف کی طرح میں اڑا دیا
تقصیر جان دینے میں ہم نے کبھو نہ کی
جب تیغ وہ بلند ہوئی سر جھکادیا

(37)

دل جو زیرِ غبار اکثر تھا | کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
اُس پہ تکیہ کیا تو تھا لیکن | رات دن ہم تھے اور بستر تھا
سرسری تم جہان سے گزرے | ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم | یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
بعد یک عمر جو ہوا معلوم | دل اُس آئینہ رُو کا پتھر تھا
بارے سجدہ ادا کیا تہِ تیغ | کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا
کیوں نہ ابر سیہ سفید ہوا | جب تلک عہد دیدۂ تر تھا
اب خرابا ہوا جہان آباد | ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گِلہ غافل ق | رہ تسلّی کہ کس گئے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال | اِک ازاں جملہ اب سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیرِ نگیں | ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زرو گوہر | چاہیے جس قدر میسّر تھا

آخر کار جب جہاں سے گیا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

(38)

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا | اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا
اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ | کس کا غبار تھا کہ یہ دُنبالہ گرد تھا
دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں | واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا
مانند حرف صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا | دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا
تھا پُشتہ ریگ باد یہ اک وقت کارواں | یہ گرد باد کوئی بیاباں نورد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

(39)

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا
اُس باد نے ہمیں تو دیا سا بُجھا دیا

سمجھی نہ بادِ صبح کہ آکر اُٹھا دیا
اُس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا

اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ
پانی کے بُلبُلے کی طرح سے مٹا دیا

سب شور ما و من کو لیے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فسانے نے آخر سُلا دیا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

اجزاء بدن کے جتنے تھے، پانی ہو بہہ گئے
آخر گدازِ عشق نے ہم کو بہا دیا

ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں
دل جو دیا تھا سو تو دیا سر جُدا دیا

(40)

دُوریِٔ یار میں ہے حالِ دل ابتر اپنا
ہم کو سو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا

لب پہ لب رکھ کے نہ اس گل کے کبھو ہم سوئے
یہ بساطِ خس و خاشاک ہے بستر اپنا

کیسی رسوائی ہوئی عشق میں کیا نقل کریں
شہر و قصبات میں مذکور ہے گھر گھر اپنا

اُس گلِ تر کی قبا کے کہیں کھولے تھے بند
رنگوں گل برگ کے ناخن ہے معطر اپنا

پیش کچھ آؤ کہیں ہم تو ہیں ہر صورت سے
مثلِ آئینہ نہیں چھوڑتے ہم گھر اپنا

(41)

کیا میرؔ دل شکستہ بھی وحشی مثال تھا
دُنبالہ گردِ چشمِ سیاہ غزال تھا

آخر کو خوابِ مرگ ہمیں جا سے لے گئی
جی دیتے تک بھی سر میں اُسی کا خیال تھا

سرو اس طرف کو جیسے گنہ گار تھا کھڑا
اودھر جو آب جو کے وہ نازک نہال تھا

کیا میرے روزگار کے اہلِ سخن کی بات
ہر ناقص اپنے زعم میں صاحب کمال تھا

کیا کیا ہوائیں دیدہ ترسے نظر پڑیں
جب رونے بیٹھ جاتے تھے تب برشگال تھا

(42)

اب یار دو پہر کو کھڑا ٹک جو یاں رہا ۔۔۔ حیرت سے آفتاب جہاں کا تہاں رہا

جو قافلے گئے تھے انھوں کی اٹھی بھی گرد ۔۔۔ کیا جانیے غبار ہمارا کہاں رہا

سوکھی پڑی ہیں آنکھیں مری دیر سے جواب ۔۔۔ سیلاب ان ہی رخنوں سے مدت رواں رہا

اعضا گدازِ عشق سے ایک ایک بہہ گئے ۔۔۔ اب کیا رہا ہے مجھ میں جو میں نیم جاں رہا

اُس کے فریبِ لطف پہ مت جا کہ ہمنشیں! ۔۔۔ وہ دیر میرے حال پہ بھی مہرباں رہا

(43)

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال جو گیا ۔۔۔ سُنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں ۔۔۔ دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

کیا امتدادِ مدتِ ہجراں بیاں کروں ۔۔۔ ساعت ہوئی قیامت ومہ سال ہو گیا

دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رُخ سے باغ میں ۔۔۔ سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار

تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

(44)

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا ۔۔۔ کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

یہ بھی ہے ادا کوئی خورشید نمط پیارے ۔۔۔ منھ صبح دکھا جانا پر شام چھپا جانا

گردن کشی کیا حاصل مانند بگولے کی ۔۔۔ اس دشت میں سر گاڑے جوں سیل چلا جانا

اس گریۂ خونیں کا ہو ضبط تو بہتر ہے ۔۔۔ اچھا نہیں چہرے پر لوہو کا بہا جانا

اے شورِ قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جاویں

اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

(45)

پھرتا ہے زندگی کے لیے آہ خوار کیا
اس وہم کی نمود کا ہے اعتبار کیا

کیا جانیں ہم اسیرِ قفس زاد اے نسیم
گل کیسے، باغ کہتے ہیں کس کو، بہار کیا

آنکھیں برنگِ نقش قدم ہو گئیں سفید
پھر اور کوئی اس کا کرے انتظار کیا

سرکش کسو سے ایسی کدورت رکھے وہ شوخ
ہم اس کی خاک راہ ہیں ہم سے غبار کیا

نے وہ نگہ چبھی ہے نہ دے پلکیں گڑ گئیں
کیا جانیے کہ دل کو ہے یہ خار خار کیا

پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم
کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا

(46)

ان سختیوں میں کس کا میلان خواب پر تھا
بالیں کی جائے ہر شب یاں سنگ زیر سر تھا

کل ہم وہ دونوں یکجا ناگاہ ہو گئے تھے
وہ جیسے برق خاطف میں جیسے ابر تر تھا

ہوش اڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اس کے
مرغ چمن اگر چہ یک مشت بال و پر تھا

پھر آج یہ کہانی کل شب پہ رہ گئی ہے
سوتا نہ رہتا تک تو قصہ ہی مختصر تھا

تھا وہ بھی اک زمانہ جب نالے آتشیں تھے
چاروں طرف سے جنگل جلتا دہر دہر تھا

(47)

یہ میرِ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا

جادو کی پُڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا
منھ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا
ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھی، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا

کس مرتبہ تھی حسرتِ دیدار مرے ساتھ
جو پھول مری خاک سے نکلا نگراں تھا

مجنوں کو عبث دعویٰ وحشت ہے مجھی سے
جس دن کہ جنوں مجھ کو ہوا تھا وہ کہاں تھا

غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
وہ گنج اسی کنجِ خرابی میں نہاں تھا

(48)

جناب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا — جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا
پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا — اپنے کیے کا ان نے ثمرہ شتاب دیکھا
دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی گم ہے — تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا
آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت — اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

(49)

عالم میں کوئی دل کا طلب گار نہ پایا — اس جنس کا یاں ہم نے خریدار نہ پایا
جاتی ہے نظر خس پہ بھی گو چشم پریدن — یاں ہم نے پر کاہ بھی بے کار نہ پایا
تصویر کے مانند لگے در ہی سے گزری — مجلس میں تری ہم نے کبھو بار نہ پایا
سوراخ ہے سینے میں ہر اک شخص کے تجھ سے — کس دل کے ترا تیرِ نگہ پار نہ پایا
مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نااہل — اس باغ میں ہم نے گلِ بے خار نہ پایا
دم بعدِ جنوں مجھ میں نہ محسوس تھا، یعنی — جامے میں مرے یاروں نے اک تار نہ پایا
آئینہ بھی حیرت سے محبت کی ہوئے ہم — پر سیر ہو اس شخص کا دیدار نہ پایا

وہ کھینچ کے شمشیرِ ستم رہ گیا جو میرؔ
خوں ریزی کا یاں کوئی سزاوار نہ پایا

(50)

اندوہ و غم کے جوش سے دل رُک کے خوں ہوا — اب کے مجھے بہار سے آگے جنوں ہوا
جی میں تھا خوب جا کے خرابے میں روئیے — سیلاب آیا، آ کے چلا، کیا شگوں ہوا
ہوں داغ نازکی کہ کیا تھا خیال بوس — گلبرگ سا وہ ہونٹ جو تھا نیلگوں ہوا
میرؔ اُن نے سرگذشت سنی ساری رات کو — افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

(51)

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب
مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب

جب میں شروع قصہ کیا آنکھیں کھول دیں
یعنی تھی مجھ کو چشم نمائی تمام شب

چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک
کی آسماں نے دیدہ درائی تمام شب

بختِ سیہ نے دیر میں کل یاوری سی کی
تھی دشمنوں سے اس کی لڑائی تمام شب

بیٹھے ہی گزری وعدے کی شب وہ نہ آ بھرا
ایذا عجب طرح کی اُٹھائی تمام شب

سناہٹے سے دل سے گزر جائیں سو کہاں
بلبل نے گو کی نالہ سرائی تمام شب

تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
دیتے رہے ہیں میر دکھائی تمام شب

(52)

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تھے بُرے مغبچوں کے تیور لیک
شیخ میخانے سے بھلا کھسکا

داغ آنکھوں سے کُھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

بحر کم ظرف ہے بسانِ حباب   ق
کاسہ لیس اب ہوا ہے تو جس کا

فیض اے ابر چشم تر سے اُٹھا
آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حالِ میر سُنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

(53)

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالا

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر
مسجد میں ہے کیا شیخ پیالا نہ نوالا

گزرے ہے لہو واں سرِ ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پانو کا چھالا

ناموس مجھے صافی طینت کی ہے ورنہ رستم نے مری تیغ کا حملہ نہ سنبھالا

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پرخشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

(54)

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا
سرکشی ہی ہے جو دکھلاتی ہے اس مجلس میں داغ
ہو سکے تو شمع ساں دیجے رگِ گردن جلا
گرمی اس آتش کے پرکالے سے رکھے چشم تب
جب کوئی میری طرح سے دیوے سب تن من جلا
ہو جو منت سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی
کاٹ اپنی رات کو خار و خسِ گلخن جلا
سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا
بجھ ہی جاتے ہیں دیے جس وقت سب روغن جلا
آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میر
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

(55)

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا سب کہیں گے یہ کہ کیا ایک نیم جاں مارا گیا
ایک نگہ سے بیش کچھ نقصان آیا اس کے تئیں اور میں بے چارا تو اے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

دل نے سر کھینچا دیارِ عشق میں اے بوالہوس وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

کب نیاز عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میرؔ سر برآستاں مارا گیا

(56)

محبت کا جب روز بازار ہوگا بکیں گے سر اور کم خریدار ہوگا

نہ خالی رہے گی مری جاگہ گر میں نہ ہوں گا تو اندوہ بسیار ہوگا

یہ منصور کا خونِ ناحق کہ حق تھا قیامت کو کس کس سے خوں دار ہوگا

زمیں گیر ہو عجز سے تو کہ اک دن یہ دیوار کا سایہ دیوار ہوگا

نہ پوچھ اپنی مجلس میں ہے میرؔ بھی یاں
جو ہوگا تو جیسے گنہ گار ہوگا

(57)

چمن میں گل نے جو کل دعویٔ جمال کیا جمال یار نے منھ اس کا خوب لال کیا

فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر برنگِ سبزۂ نورستہ پائمال کیا

مری اب آنکھیں نہیں کھلتیں ضعف سے ہمدم نہ کہہ کہ نیند میں ہے تو یہ کیا خیال کیا

بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو چمن کو یُمن قدم نے ترے نہال کیا

جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف کسو نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

(58)

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا

دہر میں میں خاک بسر ہی رہا عُمر کو اس طور بسر کر گیا

دل نہیں ہے منزلِ سینہ میں اب یاں سے وہ بیچارہ سفر کر گیا

حیف جو وہ نسخۂ دل کے اُوپر سر سری سی ایک نظر کر گیا
کس کو مرے حال سے تھی آگہی نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

(59)

رکھتا ہے ہم سے وعدہ ملنے کا یار ہر شب سو جاتے ہیں ولیکن بخت کنار ہر شب
مدّت ہوئی کہ اب تو ہم سے جدا رکھے ہے اُس آفتاب رو کو یہ روزگار ہر شب
دیکھیں ہیں راہ کس کی یارب کہ اختروں کی رہتی ہیں باز آنکھیں چندیں ہزار ہر شب
دل کی کدورت اپنی یک شب بیاں ہوئی تھی رہتا ہے آسماں پر تب سے غبار ہر شب
مجلس میں، میں نے اپنا سوزِ جگر کہا تھا
روتی ہے شمع تب سے بے اختیار ہر شب

(60)

کس کی مسجد، کیسے میخانے، کہاں کے شیخ وشاب ایک گردش میں تری چشم سیہ کے سب خراب
تو کہاں، اس کی کمر کیدھر، نہ کریو اضطراب اے رگِ گُل دیکھیو کھاتی ہے جو تو پیچ وتاب
مُوند رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب
مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشکِ آب دار مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب
کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میر
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

(61)

منھ دھوتے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب
کھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب

ہر خانہ کیوں نہ صبح جہاں میں ہو پُر فروغ
پھرتا ہے جھانکتا اُسی کو گھر گھر آفتاب

نازک مزاج ہے تو کہیں گھر سے مت نکل
ہوتا ہے دوپہر کے تئیں سر پر آفتاب

پیدا ہے روز مشرق نو کی نمود سی
آئے ہے کوئے یار سے بچ بچ کر آفتاب

ہو پست اُس کے نور کا زیرِ زمیں گیا
ہر چند سب ستاروں سے تھا برتر آفتاب

اُس رُخ کی روشنی میں نہ معلوم کچھ ہوا
مہ گم کدھر ہوا ہے گیا کیدھر آفتاب

روشن ہے یہ کہ خوف ہے اُس غصہ ور کا میر
نکلے ہے صبح کانپتا جو تھر تھر آفتاب

(62)

پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات

اک دن تو وفا بھی کرتے وعدہ
گزری ہے امیدوار ہر رات

مکھڑے سے اٹھائیں ان نے زلفیں
جانا بھی نہ ہم گئی کدھر رات

تو پاس نہیں ہوا تو روتے
رہ رہ گئی ہے پہر پہر رات

دل وصل کا یوں کٹا کہے تو
کاٹے ہے جدائی کی مگر رات

(63)

چھٹتا ہی نہیں، ہو جسے آزار محبت
مایوس ہوں میں بھی کہ ہوں بیمار محبت

تقصیر نہ خوباں کی نہ جلاّد کا کچھ جرم
تھا دشمن جانی مرا اقرار محبت

ہر جنس کے خواہاں ملے بازار جہاں میں
لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت

ہر نقشِ قدم پر ترے سر بیچے ہیں عاشق
ٹک سیر تو کر آج تو بازار محبت

کچھ مست ہیں ہم دیدۂ پُر خونِ جگر سے
آیا یہی ہے ساغرِ سرشار محبت

بیکار نہ رہ عشق میں تو رونے سے ہرگز
یہ گریہ ہی ہے آب رخِ کار محبت

مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یہ کب مانے ہے عاقل
ہر سر نہیں اے میر سزاوار محبت

(64)

روزانہ ملوں یار سے یا شب ہو ملاقات	کیا فکر کروں میں کہ کسو ڈھب ہو ملاقات
نے بخت کی یاری ہے نہ کچھ جذب ہے کامل	وہ آپ ہی ملے تو ملے پھر جب ہو ملاقات
دوری میں کروں نالۂ فریاد کہاں تک	یک بار تو اس شوخ سے یارب ہو ملاقات
جاتی ہے غشی بھی کبھو آتے ہیں بخود بھی	کچھ لطف اٹھے بارے اگر اب ہو ملاقات

وحشت ہے بہت میرؔ کو مل آیئے چل کر
کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

(65)

دور گردوں سے ہوئی کچھ اور میخانے کی طرح	بھر نہ آویں کیونکہ آنکھیں میری پیمانے کی طرح
آنکلتا ہے کبھو ہنستا تو ہے باغ و بہار	اس کی آمد میں ہے ساری فصل گل آنے کی طرح
چشمکِ انجم میں اتنی دل کشی آگے نہ تھی	سیکھ لی تاروں نے اس کی آنکھ جھکانے کی طرح
آج کچھ شہر وفا کی کیا خرابی ہے نئی	عشق نے مدت سے یاں ڈالی ہے ویرانے کی طرح
کس طرح جی سے گزر جاتے ہیں آنکھیں موند کر	دیدنی ہے دردمندوں کے بھی مرجانے کی طرح
یوں بھی سر چڑھتا ہے اے ناصح کوئی مجھ سے کہ ہائے	ایسے دیوانے کو سمجھاتے ہیں سمجھانے کی طرح

جان کا صرفہ نہیں ہے کچھ تجھے کڑھنے میں میرؔ
غم کوئی کھاتا ہے میری جان غم کھانے کی طرح

(66)

اگرچہ لعل بدخشاں میں رنگ ڈھنگ ہے شوخ	یہ تیرے دونوں لبوں کا بھی کیا ہی رنگ ہے شوخ
کبھو تو نیو چلا کر ستم کھنچیں کب تک	کماں کے طور سے تو سخت خانہ جنگ ہے شوخ
بغیر بادہ تو یوں گرم آکے کب ملتا	نشہ ہے زور تجھے اس کی یہ ترنگ ہے شوخ

خیال چاہ کے سر رشتے کا تجھے کب ہے　　ترے تو ہاتھ میں شام و سحر پتنگ ہے شوخ

ابھی تو آنے میں عرصہ ہے کچھ قیامت کے　　قدِ بلند کو کھینچ اپنے کیا درنگ ہے شوخ

بر آر میرؔ سے کس طرح تیری صحبت ہو

تجھے تو نام سے اس خستہ جاں کے ننگ ہے شوخ

(67)

تجھ بن اے نو بہار کے مانند　　چاک ہے دل انار کے مانند

پہنچی شاید جگر تک آتشِ عشق　　اشک ہیں سب شرار کے مانند

کیا دماغ اس کی رہ سے اٹھنے کا　　بیٹھے اب ہم غبار کے مانند

کوئی نکلے کلی تو لالے کی　　اس دلِ داغدار کے مانند

سرو کو دیکھ غش کیا ہم نے　　تھا چمن میں وہ یار کے مانند

ہار کر شب گلے پڑے اس کے　　ہم بھی پھولوں کے ہار کے مانند

برق تڑپی بہت ولے نہ ہوئی　　اس دلِ بے قرار کے مانند

زخم کھا بیٹھیو جگر پر مت　　تو بھی مجھ دل فگار کے مانند

اس کی سر تیز ہر پلک ہے میرؔ

خنجرِ آب دار کے مانند

(68)

فرصت سے اس چمن کی کل رو کے میں جو پوچھا　　چشمک کی ایک گُل نے میری طرف کو ہنس کر

جی رُک گیا کہیں تو پھر ہووے گا اندھیرا　　مت چھیڑ ابر مجھ کو یوں ہی برس برس کر

اس قافلے میں کوئی دل آشنا نہیں ہے　　ٹکڑے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر

صیاد اگر اجازت گلگشت کی نہیں تک　　دیوار باغ کو تو بارے درِ قفس کر

(69)

چمکی ہے جب سے برقِ سحر گلستاں سے اور
جی لگ رہا ہے خار و خس آشیاں کی اور

رنگ سخن تو دیکھ کہ حیرت سے باغ میں
رہ جاتے ہیں گے دیکھ کے گل اُس دہاں کی اور

کیا بے خبر ہے رفتنِ رنگینِ عمر سے
جو ے چمن میں دیکھ ٹک آبِ رواں کی اور

آیا کسے تکدّرِ خاطر ہے زیرِ خاک
جاتا ہے اکثر اب تو غبار آسماں کی اور

(70)

دست کش نالہ پیش رو گریہ
آہ چلتی ہے یاں علم لے کر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

بارہا صید گہ سے اس کی گئے
داغِ یاس آہوے حرم لے کر

ضعف یاں تک کھنچا کہ صورت گر
رہ گئے ہاتھ میں قلم لے کر

(71)

جنوں میں اب کے کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
گئی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پر ہیں دیکھنے قابل
کہ اک عالم رکھے ہے عالمِ تصویر بھی آخر

یکایک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان کے لاگو
کبھو آدم ہی سے ہو جاتی ہے تقصیر بھی آخر

نہ دیکھی ایک واشد اپنے دل کی اس گلستاں میں
کھلے پاؤں ہزاروں غنچۂ دلگیر بھی آخر

سرو کار آہ کب تک خامہ و کاغذ سے یوں رکھیے
رکھے ہے انتہا احوال کی تحریر بھی آخر

پھرے ہے باولا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میرؔ بھی آخر

(72)

غصے سے اٹھ چلے تو ہو دامن کو جھاڑ کر
جاتے رہیں گے ہم بھی گریبان پھاڑ کر

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

یارب رہ طلب میں کوئی کب تلک پھرے
تسکین دے کہ بیٹھ رہوں پانو گاڑ کر

غالب کہ دیوے قوتِ دل اس ضعیف کو
تنکے کو جو دکھاوے ہے پل میں پہاڑ کر

اس فن کے پہلوانوں سے کشتی رہی ہے میرؔ
بہتوں کو ہم نے زیر کیا ہے پچھاڑ کر

(73)

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے
پھر مر گئے ترے تئیں یک بار دیکھ کر

ناخواندہ خطِ شوق لگے چاک کرنے تو
قاصد تو کہیو ٹک کہ جفا کار دیکھ کر

کوئی جو دم رہا ہے سو آنکھوں میں ہے پھر اب
کریو ٹک ایک وعدۂ دیدار دیکھ کر

دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہے
حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

طالع نے چشم پوشی کی یاں تک کہ ہم نشیں
چھپتا ہے مجھ کو دور سے اب یار دیکھ کر

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

(74)

دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار
اے انتظار تجھ کو کسی کا ہے انتظار

ساقی تو ایک بار تو توبہ مری تڑا
توبہ کروں جو پھر تو ہے توبہ ہزار بار

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر
آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

کس ڈھب سے راہِ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے — پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار
کوچے کی اُس کے راہ نہ بتلائی بعدِ مرگ — دل میں صبا رکھے تھی مری خاک سے غبار
اب پائے خم کہ گردشِ ساغر ہو دست گیر — مرہونِ دردِ سر ہو کہاں تک مرا خمار

وسعت جہاں کی چھوڑ جو آرام چاہے میر
آسودگی رکھے ہے بہت گوشۂ مزار

(75)

قیامت تھا سماں اس خشمگیں پر — کہ تلواریں چلیں ابرو کی چیں پر
نہ دیکھا آخر اس آئینہ رو کو — نظر سے بھی نگاہِ واپسیں پر
گئے دن عجز و نالہ کے کہ اب ہے — دماغ نالہ چرخ ہفتمیں پر
ہوا ہے ہاتھ گل دستہ ہمارا — کہ داغ خوں بہت ہے آستیں پر
خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جی کو — نظر اپنی نہیں ہے مہر و کیں پر
پر افشانی قفس ہی کی بہت ہے — کہ پروازِ چمن قابل نہیں پر
جگر میں اپنے باقی روتے روتے — اگرچہ کچھ نہیں اے ہم نشیں، پر
کبھو جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو — تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

(76)

ہو چکا خونِ جگر رونا نہیں کچھ کم ہنوز — ہیں مژہ دستورِ سابق ہی یہ میرے نم ہنوز
دل جلوں پر روتے ہیں جن کو ہے کچھ سوزِ جگر — شمع رکھتی ہے ہماری گور پر ماتم ہنوز
وضع یکساں اس زمانے میں نہیں رہتی کہیں — قد ترا چوگاں رہا ہے کس طرح سے خم ہنوز
آ رہا ہے جی مرا آنکھوں میں اک پل اور ہوں — پر نہیں جاتا کسی کے دیکھنے کا غم ہنوز

وہ جو عالم اس کے اوپر تھا سو خط نے کھو دیا
مبتلا ہے اس بلا میں میر اک عالم ہنوز

(77)

ضبط کرتا نہیں بکنارہ ہنوز ہے گریبان پارہ پارہ ہنوز
آتش دل نہیں بجھی شاید قطرۂ عشق ہے شرارہ ہنوز
اشک جھمکا ہے جب نہ نکلا تھا چرخ پر صبح کا ستارہ ہنوز
لب پہ آتی ہے جان کب کی ہے اُس کی موقوف یک اشارہ ہنوز

(78)

ہوتا نہیں ہے باب اجابت کا واہنوز بسمل پڑی ہے چرخ پہ میری دعا ہنوز
غنچے چمن چمن کھلے اس باغ دہر میں دل ہی مرا ہے جو نہیں ہوتا ہے وا ہنوز
احوال نامہ برسے مرا سُن کے کہہ اٹھا جیتا ہے وہ ستم زدہ مہجور کیا ہنوز
غنچہ نہ بُوجھ دل ہے کسی مجھ سے زار کا کھلتا نہیں جو سعی سے تیری صبا ہنوز
چلّو میں اُس کے میرا لہو تھا سو پی چکا اُڑتا نہیں ہے طائر رنگِ حنا ہنوز
بے بال و پر اسیر ہوں کنج قفس میں میرؔ
جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

(79)

مرگیا میں پہ مرے باقی ہیں آثار ہنوز تر ہیں سب سر کے لہو سے در و دیوار ہنوز
بارہا چل چکی تلوار تری چال پہ شوخ تو نہیں چھوڑتا اس طرز کی رفتار ہنوز
کوئی تو آبلہ پا دشت جنوں سے گزرا ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سر خار ہنوز
منتظر قتل کے وعدے کا ہوں اپنے، یعنی جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہ گار ہنوز
اڑ گئے خاک ہو کتنے ہی ترے کوچے سے باز آتے نہیں پر تیرے ہوا دار ہنوز

(80)

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش | رہتی ایک آدھ دن بہار اے کاش
یہ جو دو آنکھ مند گئیں میری | اُس پہ وا ہوتیں ایک بار اے کاش
اس میں راہِ سخن نکلتی تھی | شعر ہوتا ترا شعار اے کاش
شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر | اس سے ہوتے نہ ہم دو چار اے کاش

(81)

اے ابر تر تو اور کسی سمت کو برس | اس ملک میں ہماری ہے یہ چشم تر ہی بس
حرماں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا | اک برگ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس
مژگاں بھی بہہ گئیں مرے رونے سے چشم کی | سیلاب موج مارے تو ٹھہرے ہے کوئی خس
مجنوں کا دل ہوں محمل لیلیٰ سے ہوں جدا | تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس
اے گریہ اس کے دل میں اثر خوب ہی کیا | روتا ہوں جب میں سامنے اس کے تو دے ہے ہنس

حیراں ہوں میرؔ نزع میں اب کیا کروں بھلا
احوال دل بہت ہے مجھے فرصت اک نفس

(82)

مر گیا میں ملا نہ یار افسوس | آہ افسوس صد ہزار افسوس
ہم تو ملتے تھے جب اہا ہا ہا | نہ رہا ڈوہیں روزگار افسوس
یوں گنواتا ہے دل کوئی مجھ کو | یہی آتا ہے بار بار افسوس
قتل کر تو ہمیں کرے گا خوشی | یہ توقع تھی تجھ سے یار افسوس
رخصتِ سیرِ باغ تک نہ ہوئی | یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

خاک پر میرؔ تیری ہوتا ولے
نہ ہوا اتنا اقتدار افسوس

(83)

ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش
کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش

ابر وے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب
موتی کسی کی بات ہے سیپی کسی کا گوش

حیرت سے ہو وے پر تو مہ نورِ آئینہ
تو چاندنی میں نکلے اگر ہو سفید پوش

کل ہم نے سیر باغ میں دل ہاتھ سے دیا
اک سادہ گل فروش کا آ کر سبد بدوش

جاتا رہا نگاہ سے جوں موسمِ بہار
آج اس بغیر داغِ جگر ہیں سیاہ پوش

(84)

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گُہر کی طرف

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

لگی ہیں ہزاروں ہی آنکھیں ادھر
اک آشوب ہے اُس کے گھر کی طرف

بہت رنگ ملتا ہے دیکھو کبھو
ہماری طرف سے سحر کی طرف

(85)

اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک
آشوب نالہ اب تو پہنچا ہے لامکاں تک

تصویر کی سی شمعِ خاموش جلتے ہیں ہم
سوزِ دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک

روتے پھرے ہیں لوہو، یک عمر اس گلی میں
باغ و بہار ہی ہے جاوے نظر جہاں تک

آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے
انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک

بے لطف تیرے کیونکر تجھ تک پہنچ سکیں ہم
ہیں سنگِ راہ اپنے کتنے یہاں سے واں تک

(86)

ہیں بعد مرے مرگ کے آثار سے اب تک — سوکھا نہیں لوہو در و دیوار سے اب تک
مدّت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہمیں شہر میں مرتے — واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک
برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موئے لیک — اک دُود سا اُٹھتا ہے چمن زار سے اب تک
کیا جانیے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے — پوچھا نہیں اُن نے تو ہمیں پیار سے اب تک
اس باغ میں اغلب ہے کہ سرزد نہ ہوا ہو
یوں نالہ کِسو مُرغِ گرفتار سے اب تک

(87)

میرؔ گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک — جس کی لے دام سے تا گوشِ گُل آواز ہے ایک
کچھ ہو اے مرغِ قفس لطف نہ جاوے اُس سے — نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ — ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شورِ جہاں — سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
چاہے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں درآ
عالم آئینے کے مانند درباز ہے ایک

(88)

بالیں پہ میری آوے گا تو گھر سے جب تلک — کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک
اتنا دن اور دل سے طپش کر لے کاوشیں — یہ مرحلہ تمام ہی ہے آج شب تلک
نقاش کیوں کہ کھینچ چکا تو شبیہِ یار — کھینچوں ہوں ایک نازہی اس کا میں اب تلک

شب کوتہ اور قصہ مری جان کا دراز — القصہ اب کہا کروں تجھ سے میں کب تلک

باقی یہ داستان ہے اور کل کی رات ہے
گر جان میری میرؔ نہ آپہنچے لب تلک

(89)

شوق ہے تو ہے اس کا گھر نزدیک — دوریٔ رہ ہے راہ بر نزدیک

آہ کرنے میں دم کو سادھے رہ — کہتے ہیں دل سے ہے جگر نزدیک

ڈوبیں دریا و کوہ و شہر و دشت — تجھ سے سب کچھ ہے چشم تر نزدیک

دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں — ہم جو تم سے تھے بیشتر نزدیک

خبر آتی ہے سو بھی دور سے یاں — آؤ، یک بار بے خبر نزدیک

توشۂ آخرت کا فکر رہے — جی سے جانے کا ہے سفر نزدیک

دُور پھرنے کا ہم سے وقت گیا — پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک

مر بھی رہ میرؔ شب بہت رویا
ہے مری جان اب سحر نزدیک

(90)

کہیں پہنچو بھی مجھ بے پاؤ سر تک — کہ پہنچا شمع ساں داغ اب جگر تک

کچھ اپنی آنکھ میں یاں کا نہ آیا — خزف سے لے کے دیکھا دُرِّ تر تک

جسے شب آگ سا دیکھا سلگتے — اسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

ترا منہ چاند سا دیکھا ہے شاید — کہ انجم رہتے ہیں ہر شب ادھر تک

جب آیا آہ تب اپنے ہی سر پر — گیا یہ ہاتھ کب اس کی کمر تک

ہم آوازوں کو سیراب کی مبارک — پر و بال اپنے بھی ایسے تھے پر تک

کھنچی کیا کیا خرابی زیرِ دیوار — ولے آیا نہ وہ ٹک گھر سے در تک

گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک

کہاں پھر شورِ شیون جب گیا میرؔ
یہ ہنگامہ ہے اس ہی نوحہ گر تک

(91)

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک رسوائیاں گئی ہیں عقیقِ یمن تلک

آزادگی پہ چھوڑ قفس ہم نہ جاسکے حسنِ سلوکِ ضعف سے صحنِ چمن تلک

تر دستیاں ہوں دست و گریبان ہاتھ کی زیرِ زمیں بھی پہنچیں گی چاکِ کفن تلک

مارا گیا خرامِ بتاں پر سفر میں میرؔ
اے کبک کہتا جائیو اس کے وطن تلک

(92)

فصلِ خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقش پائے گل

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل

مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ یہ چشمکِ پیالہ ہے ساقی ہوائے گل

یہ دیکھ سینہ داغ سے رشکِ چمن ہے یاں بلبل ستم ہوا نہ جو تو نے بھی کھائے گل

بلبل ہزار جی سے خریدار اس کی ہے اے گل فروش کریو سمجھ کر بہائے گل

بارے سرشکِ سرخ کے داغوں سے رات کو بستر پر اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھائے گل

آ عندلیب صلح کریں جنگ ہو چکی لے اے زباں دراز تو سب کچھ سوائے گل

گل چیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میرؔ کے
لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

(93)

کیسا چمن اسیری میں کس کو ادھر خیال　　پرواز خواب ہوگئی ہے بال و پر خیال
مشکل ہے مٹ گئے ہوئے نقشوں کی پھر نمود　　جو صورتیں بگڑ گئیں ان کا نہ کر خیال
مو کو عبث ہے تاب کلی یوں ہی تنگ ہے　　اس کا دہن ہے وہم و گمان و کمر خیال
رُخسار پر ہمارے ڈھلکنے کو اشک کے　　دیکھے ہے جو کوئی سو کرے ہے گہر خیال

کس کو دماغ شعر و سخن ضعف میں کہ میرؔ
اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

(94)

نہ تک واشد ہوئی جب سے لگا دل　　الٰہی غنچہ ہے پژمردہ یا دل
نہ اس سے یاں تئیں آیا گیا حیف　　رہے ہم جب تک اس میں رہا دل
اٹھایا داغ لالہ نے چمن سے　　کروں کیا دیکھتے ہی جل گیا دل
نہیں کم رایت اقبال شہ سے　　علم اپنا یہ دنیا سے اٹھا دل
ہمارا خاص مشرب عشق اس میں　　پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل
ہمارے منھ پہ طفل اشک دوڑا　　کیا ہے اس بھی لڑکے نے بڑا دل

سبھوں سے میرؔ بیگانے سے رہتے
جو ہوتا اس سے کچھ بھی آشنا دل

(95)

نہ خوشہ یاں نہ دانہ یاں جلا، گھاس کیا حاصل　　ترا اے برق خاطف اس طرف گرنا ہے لاحاصل
سکندر ہو کے مالک سات اقلیموں کا آخر کو　　گیا دست تہی لے یاں سے یہ کچھ کر گیا حاصل
بلا قحط مروت ہے کہ ہے محصول غلے پر　　کہیں سے چار دانے لاؤ لیویں جابجا حاصل
نہ کھینچیں کیونکہ نقصاں ہم تو قیدی ہیں تعین کے　　خودی سے کوئی نکلے تو اسے ہووے خدا حاصل

عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی ولے مطلب ہی گم دیکھیں تو کب ہو مدعا حاصل
بہت مصروف کشت و کار تھے مزرع میں دنیا کے اٹھا حسرت سے ہاتھ آخر ہمیں یہ کچھ ہوا حاصل
پھرا مت میرؔ سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں
سنے کوئی تو کچھ کہیے بھی اس کہنے کا کیا حاصل

(96)

سیر کر عندلیب کا احوال ہیں پریشاں چمن میں کچھ پروبال
تپ غم تو گئی طبیب ولے پھر نہ آیا کبھو مزاج بحال
سبزہ نورستہ رہگزار کا ہوں سر اٹھایا کہ ہوگیا پامال
کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال
سرد مہری کی بس کہ گل رونے اوڑھی ابر بہار نے بھی شال

(97)

میرؔ آج وہ بدمست ہے ہشیار رہو تم ہے بے خبری اس کو خبردار رہو تم
جی جائے کسی کا کہ رہے تم کو قسم ہے مقدور تلک درپے آزار رہو تم
وہ محو جمال اپنی ہے پروا نہیں اس کو خواہاں رہو تم اب کہ طلب گار رہو تم
اس معنی کے ادراک سے حیرت ہی ہے حاصل آئینہ نمط صورت دیوار رہو تم
یک بار ہوا دل کی تسلی کا وہ باعث یہ کیا کہ اسی طور پہ ہر بار رہو تم
ہو لطف اسی کا تو کوئی کام کو پہنچے تسبیح گلے ڈالو کہ زنار رہو تم
کیا میرؔ بری چال سے جینے کی چلے ہے
بہتر ہے کہ اپنے تئیں اب مار رہو تم

(98)

جانا کہ شغل رکھتے ہو تیر و کماں سے تم
پر مل چلا کرو بھی کسو خستہ جاں سے تم

ہم اپنی چاک جیب کو سی رہتے یا نہیں
پھاٹے میں پانو دیتے کو آئے کہاں سے تم

اب دیکھتے ہیں خوب تو وہ بات ہی نہیں
کیا کیا وگرنہ کہتے تھے اپنی زباں سے تم

جاؤ نہ دل سے منظرِ تن میں ہے جا یہی
پچھتاؤ گے اٹھو گے اگر اس مکاں سے تم

قصہ مرا سنو گے تو جاتی رہے گی نیند
آرامِ چشم مت رکھو اس داستاں سے تم

جتنے تھے کل تم آج نہیں پاتے اتنا ہم
ہر دم چلے ہی جاتے ہو آبِ رواں سے تم

رہتے نہیں ہو بن گئے میرؔ اس گلی میں رات
کچھ راہ بھی نکالو سگ و پاسباں سے تم

(99)

کرتے ہیں گفتگو سحر اٹھ کر صبا سے ہم
لڑنے لگے ہیں ہجر میں اس کے ہوا سے ہم

ہوتا نہ دل کا تا یہ سر انجام عشق میں
لگتے ہی جی کے مر گئے ہوتے بلا سے ہم

چھوٹا نہ اس کا دیکھنا ہم سے کسو طرح
پایانِ کار مارے گئے اس ادا سے ہم

داغوں ہی سے بھری رہی چھاتی تمام عمر
یہ پھول گل چنا کیے باغ وفا سے ہم

غافل نہ اپنی دیدہ درائی سے ہم کو جان
سب دیکھتے ہیں پر نہیں کہتے حیا سے ہم

آئینے کی مثال پس از صد شکست میرؔ
کھینچا بغل میں یار کو دستِ دعا سے ہم

(100)

جو رہے یوں ہی غم کے مارے ہم
تو یہی آج کل سدھارے ہم

مرتے رہتے تھے اس پہ یوں پر اب
جا لگے گور کے کنارے ہم

دن گزرتا ہے دم شماری میں
شب کو رہتے ہیں گنتے تارے ہم

بے مروت سے اپنی وحشت دور
انس رکھتے ہیں تم سے پیارے ہم

زندگی بار دوش آج ہے یاں
دیکھیں گے کل جو ہوں گے بارے ہم

جا چکی بازی یعنی مرتے ہیں
جیتے تم یہ قمار ہارے ہم

میر آؤگے آپ میں بھی کبھو
سخت مشتاق ہیں تمھارے ہم

(101)

گئے عشق کی راہ سر پر قدم
بلا پر چلے آئے ہر ہر قدم

عجب راہ پر خوف و مشکل گزر
اٹھایا گیا ہم سے مر مر قدم

بہت مستی عشق پالغز تھی
خدا جانے پڑتا تھا کیدھر قدم

رہا ہوگا خالی بدن جاں سے جب
چلے ہوں گے یہ راہ جو بھر قدم

وہ عیار یوں چشم تر سے گیا
کہ ہرگز نہ اس کا ہوا تر قدم

جگر کو ہے ان سر سے گزروں سے عشق
گئے جو ہمارے قدم بر قدم

جو کچھ آوے سالک کے آگے ہے خیر
رکھا ہم نے اب گھر سے باہر قدم

ہمیں سرکشی سر بلندی سے کیا
رہے ضعف میں ہم تو سردر قدم

کہیں کیا کف پا میں میر آبلے
چلیں ہم سروں پر مگر دھر قدم

(102)

مشتاق ان لبوں کے ہیں سب مرد وزن تمام
دفتر لکھے گئے نہ ہوا پر سخن تمام

آوارہ گرد باد سے تھے ہم پہ شہر میں
کیا خاک میں ملا ہے یہ دیوانہ پن تمام

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اُگلا پڑے ہے جامے سے ان کا بدن تمام

اک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی
دیکھا برنگ آب رواں یہ چمن تمام

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانہ دکن تمام

(103)

جی کے تئیں چھپاتے نہیں یوں تو غم سے ہم | پر تنگ آگئے ہیں تمھارے ستم سے ہم
اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عمر | پر کچھ نہ پوچھو کچھ نہیں جاتے ہم سے ہم
زانو پہ سر ہے قامت خم گشتہ کے سبب | پیری میں اپنی آن لگے ہیں قدم سے ہم
روتے بھی ان نے دیکھ کے ہم کو کیا نہ رحم | اک چشم داشت رکھتے تھے مژگان نم سے ہم
زنار سا بندھا ہے گلے اپنے اب تو کفر | بدنام ہیں جہان میں عشق صنم سے ہم
لوگوں کو وصف کرنے سے بالیدگی ہوئی | جوں شیشہ پھیل پھوٹ پڑے ان کے دم سے ہم

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میرؔ
کیا کیا کہا کریں ہیں زبان قلم سے ہم

(104)

آنک شتاب جاتے ہیں ورنہ جہاں سے ہم | کچھ ہو رہے ہیں غم میں ترے نیم جاں سے ہم
وعدہ کرو تو سوچ لو مدت کو دل میں بھی | یہ حال ہے تو دیر رہیں گے کہاں سے ہم
الجھاؤ دل کا جس سے ہے جھنجھلا کے اس بغیر | جھگڑا کیا کریں ہیں زمین آسماں سے ہم
لاویں ہماری خاک پر اس کینہ ور کو بھی | یہ کہہ مریں گے اپنے ہر اک مہرباں سے ہم
دربان سنگدل نے خبر واں تلک نہ کی | سر مار مار صبح کی اس آستاں سے ہم

جب اس کی تیغ رکھنے لگا اپنے پاس میرؔ
امید قطع کی تھی تبھی اس جواں سے ہم

(105)

کب تک رہیں گے پہلو لگائے زمیں سے ہم | یہ درد اب کہیں گے کسو شانہ بیں سے ہم
ٹکواریں کتنی کھائی ہیں سجدے میں اس طرح | فریادی ہوں گے مل کے لہو کو جبیں سے ہم
ہوتا ہے شوق وصل کا انکار سے زیاد | کب تجھ سے دل اٹھاتے ہیں تیری نہیں سے ہم

چھاجے جو پیش دستی کرے نور ماہ پر　　دیکھی عجب سفیدی تری آستیں سے ہم

تکلیف درد دل کی نہ کر تنگ ہوں گے لوگ　　یہ بات روز کہتے رہے ہم نشیں سے ہم

اڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں　　سونا لیا ہے گودوں میں بھر کر وہیں سے ہم

آوارہ گردی اپنی کھنچی میر طول کو

اب چاہیں گے .جا کسو عزلت نشیں سے ہم

(106)

نہیں تبخال لعل دلربا میں　　گہر پہنچا بہم آب بقا میں

غریبانہ کوئی شب روز کر یاں　　ہمیشہ کون رہتا ہے سرا میں

اٹھاتے ہاتھ کیوں نومید ہو کر　　اگر پاتے اثر کچھ ہم دعا میں

کہے ہے ہر کوئی اللہ میرا　　عجب نسبت ہے بندے میں خدا میں

ادھر جانے کو آندھی تو ہے لیکن　　سبک پائی سی ہے باد صبا میں

بلا تہ دار بحر عشق نکلا　　نہ ہم نے انتہا کی ابتدا میں

ملے برسوں وہی بیگانہ ہے وہ　　ہنر ہے یہ ہمارے آشنا میں

اگرچہ خشک ہیں جیسے پر کاہ

اڑے ہیں میر جی لیکن ہوا میں

(107)

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں　　یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

حال کیا پوچھ پوچھ جاتے ہو　　کبھی پاتے بھی ہو بحال ہمیں

تنگی اس جا کی نقل کیا کریے　　یاں سے واجب ہے انتقال ہمیں

صرف للہ خم کے خم کرتے　　نہ کیا چرخ نے کلال ہمیں

کیا تک اس تنگنا میں کھینچیے رنج　　یاں سے یارب تو ہی نکال ہمیں

ترکِ سبزانِ شہر کریے اب بس بہت کر چکے نہال ہمیں

وجہ کیا ہے کہ میؔر منہ پہ ترے
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

(108)

نہ کیوں کہ شیخ توکّل کو اختیار کریں زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں
گیا وہ زمزمۂ صبحِ فصلِ گل بلبل دُعا نہ پہنچے چمن تک ہم اب ہزار کریں
تمام صید سر تیر جمع ہیں لیکن نصیب اُس کے کہ جس کو ترا شکار کریں
تسلّی تو ہو دلِ بے قرار خوباں سے یہ کاش ملنے نہ ملنے کا کچھ قرار کریں
ہمیں تو نزع میں شرمندہ آ کے اُن نے کیا رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں
کرے ہیں حادثے ہر روز وار آخر تو سنانِ آہ دلِ شبؔ کے ہم بھی پار کریں

ہوا ہوں خاکِ رہ اس واسطے کہ خوباں میؔر
گزار گور پہ میری بھی ایک بار کریں

(109)

اگرچہ اب کی ہم اے ابر خشک مژگاں ہیں پہ جوش دل میں کبھی آیا گیا تو طوفاں ہیں
چمن میں جا کے بھرو تم گلوں سے جیب و کنار ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں
رہیں ہیں دیکھ جو تصویر سے ترے منھ کو ہماری آنکھوں سے ظاہر ہے یہ کہ حیراں ہیں
رہا ہے کون سا پردہ ترے ستم کا شوخ کہ زخم سینہ ہمارے سبھی نمایاں ہیں

جو ابر دشت میں برسے تو ہم اُڑا دیں خاک
وہ میرِ آب ہے ہم یاں کے میر ساماں ہیں

جنوں نے تماشا بنایا ہمیں — رہا دیکھ اپنا پرایا ہمیں
سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے — کبھو آپ میں تم نے پایا ہمیں
شب آنکھوں سے دریا سا بہتا رہا — انھیں نے کنارے لگایا ہمیں
جلیں پیش و پس جیسے شمع و پتنگ — جلا وہ بھی جن نے جلایا ہمیں

(110)

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک — آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں
مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہے لیک — بیچ میں یہ واقعہ حائل ہے میاں
آج کیا فردائے محشر کا ہراس — صبح دیکھیں کیا ہو شب حائل ہے میاں
سامنے سے ٹک ٹلے تو دق نہ ہو — آسماں چھاتی پہ اپنی سل ہے میاں
دل لگی اتنی جہاں میں کس لیے — رہ گزر ہے یہ تو کیا منزل ہے میاں
بے تہی دریائے ہستی کی نہ پوچھ — یاں سے واں تک سو جگہ ساحل ہے میاں
چشم حق بیں سے کرو ٹک تم نظر — دیکھتے جو کچھ ہو سب باطل ہے میاں
کی زیارت میرؔ کی ہم نے بھی کل — لاابالی سا ہے پر کامل ہے میاں

(111)

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں — طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
ایک بھی چشمک نہ اس مہ کی سی ہے — آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں
ایک نے صورت نہ پکڑی پیش یار — دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں
روکشی کو اس کی منھ بھی چاہیے — ماہ کے چہرے پہ ہیں سب جھائیاں
چل چمن میں یہ بھی ہے کوئی روش — ناز تا کے چند بے پروائیاں
شوق قامت میں ترے اے نونہال — گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

(112)

گزر جان سے اور ڈر کچھ نہیں　　رہِ عشق میں پھر خطر کچھ نہیں

ہوا مائل اُس سرو کا دل مرا　　بجز جور جس سے ثمر کچھ نہیں

نہ کر اپنے محوؤں کا ہرگز سُراغ　　گئے گزرے بس اب خبر کچھ نہیں

تری ہو چکی خشک مژگاں کی سب　　لہو اب جگر میں مگر کچھ نہیں

حیا سے نہیں پشتِ پا پر وہ چشم　　مرا حال مدِ نظر کچھ نہیں

کمر اس کی رشکِ رگِ جاں ہے میرؔ
غرض اس سے باریک تر کچھ نہیں

(113)

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں　　اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

ٹک سن کہ سو برس کی ناموسِ خامشی کھو　　دو چار دل کی باتیں اب منہ پر آئیاں ہیں

ہم وے ہیں خوں گرفتہ ظالم جنھوں نے تیری　　ابرو کی جنبش اوپر تلواریں کھائیاں ہیں

آئینہ ہو کے صورت معنی سے بے لبالب　　رازِ نہانِ حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

کعبے میں میرؔ ہم پر یا سرگراں ہے زاہد
یا بُت کدے میں ہم نے دھولیں لگائیاں ہیں

(114)

مرے آگے نہ شاعر نام پاویں　　قیامت کو مگر عرصے میں آویں

پری سمجھے تجھے وہم و گماں سے　　کہاں تک اور ہم اب دل چلاویں

مزاج اپنا غیور از بس بڑا ہے　　ترے غم میں کسے خاطر میں لاویں

نظر اے ابر اب مت آ مبادا　　کہیں میری بھی آنکھیں ڈبڈباویں

نہ آیا وہ تو کیا ہم نیم جاں بھی بغیر اس کے ملے دُنیا سے جاویں
چلی ہے تو تو اے جانِ الم ناک تک اک رہ جا کہ ہم رُخصت ہو آویں
چلا مقدور سے غم میرؔ آگے
زمیں پھٹ جائے یا رب ہم سماویں

(115)

میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں
پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح میں شانہ صفت سایہ رو زلفِ بتاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا میں باعث آشفتگی طبع جہاں ہوں
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبش لب کی میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیرِ زباں ہوں
ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے اس باغِ خزاں دیدہ میں، میں برگِ خزاں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہش دل بسکہ پریشاں درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں
اِک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

(116)

وے جو حسن و جمال رکھتے ہیں سارے تیرا خیال رکھتے ہیں
دہن تنگ کے ترے مشتاق آرزوے محال رکھتے ہیں
خاکِ آدم ہی ہے تمام زمین پانو کو ہم سنبھال رکھتے ہیں
یہ جو سر کھینچے تو قیامت ہے دل کو ہم پائمال رکھتے ہیں
اہل دل چشم سب تری جانب آئینے کی مثال رکھتے ہیں

(117)

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں　　اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

بے کلی دل ہی کی تماشا ہے　　برق میں ایسے اضطراب کہاں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردا　　ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں　　مجھ بلا نوش کو شراب کہاں

محو ہیں اس کتابی چہرے کے　　عاشقوں کو سرِ کتاب کہاں

عشق کا گھر ہے میؔر سے آباد　　ایسے پھر خانماں خراب کہاں

(118)

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں　　اب دو تو جام، خالی ہی دو، میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ　　جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو، میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جامِ مے　　یا تھوڑی دور ساتھ چلو، میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے　　تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو، میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میؔر جی　　جوں شیشہ مرے منھ نہ لگو، میں نشے میں ہوں

(119)

شب نہاتا تھا جو وہ رشکِ قمر پانی میں　　گتھی مہتاب سے اُٹھتی تھی لہر پانی میں

ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن　　جیسے جھمکے ہے پڑا گوہرِ تر پانی میں

رونے سے بھی نہ ہوا سبز درختِ خواہش　　گرچہ مرجاں کی طرح تھا یہ شجر پانی میں

آتشِ عشق نے راون کو جلا کر مارا　　گرچہ لنکا سا تھا اُس دیو کا گھر پانی میں

چشمِ تر ہی میں رہے کاش وہ روئے خوشرنگ　　پھول رہتا ہے بہت تازہ و تر پانی میں

روؤں تو آتشِ دل شمع نمط بجھتی نہیں　　مجھ کو لے جا کے ڈبو دیویں مگر پانی میں

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اُس کی جیسے　　بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

(120)

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
شمع ہی سر نہ دے گئی برباد کشتہ اپنی زباں کے ہم بھی ہیں
جس چمن زار کا ہے تو گل تر بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں
بوسہ مت دے کسو کے در پہ نسیم خاک اس آستاں کے ہم بھی ہیں
وجہ بیگانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

(121)

تری پلکیں چبھتی نظر میں بھی ہیں یہ کانٹے کھٹکتے جگر میں بھی ہیں
رہے پھرتے دریا میں گرداب سے وطن میں بھی ہیں ہم، سفر میں بھی ہیں
جھمک سطح رُخ کی سی اُس کی کہاں صفا و ضیا تو گہر میں بھی ہیں
دل و دِلّی دونوں اگر ہیں خراب یہ کچھ لطف اُس اجڑے گھر میں بھی ہیں

(122)

شہروں، ملکوں میں جو یہ میرؔ کہاتا ہے میاں دیدنی ہے یہ بہت کم نظر آتا ہے میاں
عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوّر بے مثل ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں
قسمت اس بزم میں لائی کہ جہاں کا ساقی دے ہے مے سب کو ہمیں زہر پلاتا ہے میاں
جھگڑا اس حادثے کا کوہ گراں سنگ کو بھی جوں پرِ کاہ اڑائے لیے جاتا ہے میاں
کیا پری خواں ہے جو راتوں کو جگادے ہے میرؔ شام سے دل جگر و جان جلاتا ہے میاں

(123)

نکلے ہے جنسِ حسن کسی کاروان میں یہ وہ نہیں متاع کہ ہو ہر دکان میں
یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے یک عشق بھر رہا ہے تمام آسمان میں

ہم اس سے آہ سوزِ دل اپنا نہ کہہ سکے — تھے آتشِ دروں سے پھپھولے زبان میں

غم کھینچنے کو کچھ تو توانائی چاہئے — سویاں نہ دل میں تاب نہ طاقت ہے جان میں

غافل نہ رہیو ہم سے کہ ہم وے نہیں رہے — ہوتا ہے اب تو حال عجب ایک آن میں

وے دن گئے کہ آتشِ غم دل میں تھی نہاں — سوزش رہے ہے اب تو ہر اک استخوان میں

دل نذر و دیدہ پیش کش اے باعثِ حیات — سچ کہہ کہ جی لگے ہے ترا کس مکان میں

کھینچا نہ کر تو، تیغ کہ اک دن نہیں ہیں ہم — ظالم قباحتیں ہیں بہت امتحان میں

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میرؔ
کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گل کے کان میں

(124)

جن کے لیے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں — اس راہ میں وے جیسے انجان نکلتے ہیں

کیا تیر ستم اس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے — جس زخم کو چیروں ہوں پیکان نکلتے ہیں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ ہیں بھرے سارے — دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

گہ لوہو ٹپکتا ہے گہ لختِ دل آنکھوں سے — یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن نکلتے ہیں

کریے تو گلہ کس سے جیسی تھی ہمیں خواہش — اب ویسے ہی یہ اپنے ارمان نکلتے ہیں

(125)

مشہور ہیں دلوں کی مرے بے قراریاں — جاتی ہیں لامکاں کو دلِ شب کی زاریاں

چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش — اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں

کوچے کی اس کے خاک بھری جسم زار پر — خالی نہیں ہیں لطف سے لوہو کی دھاریاں

تربت سے عاشقوں کے نہ اٹھا کبھو غبار — جی سے گئے ولے نہ گئیں رازداریاں

اب کس کس اپنی خواہشِ مردہ کو روئیے　　تھیں ہم کو اس سے سیکڑوں امیدواریاں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ　　مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

کیا جانتے تھے ایسے دن آجائیں گے شتاب　　روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں

گل نے ہزار رنگِ سخن سر کیا ولے　　دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میر
کاٹی تھیں کوہ کن نے بہت راتیں بھاریاں

(126)

گر کچھ ہو درد آئینہ یوں چرخ زشت میں　　ان صورتوں کو صرف کرے خاک وخشت میں

آسودہ کیوں کہ ہوں میں کہ مانندِ گرد باد　　آوارگی تمام ہے میری سرشت میں

کب تک خرابِ سعی طوافِ حرم رہوں　　دل کو اٹھا کے بیٹھ رہوں گا کنشت میں

ماتم کے ہوں زمین پہ خرمن تو کیا عجب　　ہوتا ہے نیل چرخ کی اس سبز کشت میں

سرمست ہم ہیں آنکھوں کے دیکھے سے یار کی　　کب یہ نشہ ہے دخترِ رز تجھ پلشت میں

(127)

تلوار غرقِ خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں　　دیکھیں تو تیری کب تک یہ بدشرابیاں ہیں

جب لے نقاب منہ پر تب دید کر کہ کیا کیا　　در پردہ شوخیاں ہیں پھر بے حجابیاں ہیں

چاہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اوپر　　دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں

جی بکھرے دل ڈہے ہے سر بھی گرا پڑے ہے　　خانہ خراب تجھ بن کیا کیا خرابیاں ہیں

مہمان میر مت ہو خوانِ فلک پہ ہرگز
خالی یہ مہر و مہ کی دونوں رکابیاں ہیں

(128)

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں ۔۔۔ اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا ۔۔۔ اس مُشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی ۔۔۔ اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں

عشق ان کی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے ۔۔۔ ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے ۔۔۔ اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

(129)

کیا میں نے رو کر فشارِ گریباں ۔۔۔ رگِ ابر تھا تار تارِ گریباں

نشاں اشکِ خونیں کے اڑتے چلے ہیں ۔۔۔ خزاں ہو چلی ہے بہارِ گریباں

جنوں تیری منت ہے مجھ پہ کہ تونے ۔۔۔ نہ رکھا مرے سر پہ بارِ گریباں

کہیں جائے یہ دورِ دامن بھی جلدی ۔۔۔ کہ آخر ہوا روزگارِ گریباں

پھروں میرؔ عریاں نہ دامن کا غم ہو

نہ باقی رہے تار تارِ گریباں

(130)

اب آنکھوں میں خوں دم بہ دم دیکھتے ہیں ۔۔۔ نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد ۔۔۔ ہمیں آکے اس کے قدم دیکھتے ہیں

گہے داغ رہتا ہے دل گہ جگر خوں ۔۔۔ ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں

اگر جان آنکھوں میں اُس بن ہے تو ہم ۔۔۔ ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں

لکھیں حال کیا اس کو حیرت سے ہم تو ۔۔۔ گہے کاغذ و گہ قلم دیکھتے ہیں

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ ۔۔۔ اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

کہاں تک بھلا روؤ گے میرؔ صاحب

اب آنکھوں کے گرداک ورم دیکھتے ہیں

(131)

بہت ہی اپنے تئیں ہم تو خوار پاتے ہیں ۔ وہ کوئی اور ہیں جو اعتبار پاتے ہیں
تری گلی میں میں رویا تھا دل جلا یک شب ہنوز واں سے دلِ داغدار پاتے ہیں
نہ ہو ویں شیفتہ کیوں اضطراب پر عاشق کہ جی کو کھو کے دلِ بے قرار پاتے ہیں
گلہ عبث ہے تری آستانہ بُوسی کا مسیح و خضر بھی واں کم ہی بار پاتے ہیں
تڑپھ ہے قیس کے دل میں تہِ زمیں اس سے غزالِ دشت نشانِ مزار پاتے ہیں
وگرنہ خاک ہوئے کتنے ہی محبت میں کسی کا بھی کہیں مُشتِ غبار پاتے ہیں

(132)

غزل میؔر کی کب پڑھائی نہیں کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں
زباں سے ہماری ہے صیاد خوش ہمیں اب امید رہائی نہیں
نسیم آئی میرے قفس میں عبث گلستاں سے دو پھول لائی نہیں
مری دل لگی اس کے رو سے ہی ہے گل تر سے کچھ آشنائی نہیں
سیہ طالعی میری ظاہر ہے اب
نہیں شب کہ اس سے لڑائی نہیں

(133)

صبح ہوئی گلزار کے طائر دل کو اپنے ٹٹولیں ہیں یاد میں اس خود رو گل تر کی کیسے کیسے بولیں ہیں
باغ میں جو ہم دیوانے سے جا نکلیں ہیں نالہ کناں غنچے ہو ہو مرغ چمن کے ساتھ ہمارے ہولیں ہیں
یار ہمارا آساں کیا کچھ سینہ کشادہ ہم سے ملا خون کریں ہیں جب دل کو وے بند قبا کے کھولیں ہیں
مینھ جو برسے ہے شدت سے دیکھ اندھیری کیا ہے یہ یعنی تنگ جو ہم آتے ہیں دل کو کھول کے رولیں ہیں
سرو تو ہے سنجیدہ لیکن پیشِ مصرع قدِ یار ناموزوں ہی نکلے ہے جب دل میں اپنے تولیں ہیں
مرگ کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میرؔ سمجھتے ہو
ہارے ماندے راہ کے ہیں ہم لوگ کوئی دم سولیں ہیں

(134)

ہم کو کہنے کے تئیں بزم میں جا دیتے ہیں — بیٹھنے پاتے نہیں ہم کہ اٹھا دیتے ہیں
ان طیوروں سے ہوں میں بھی اگر آتی ہے صبا — باغ کے چار طرف آگ لگا دیتے ہیں
اس شہ حسن کا اقبال کہ ظالم کے تئیں — ہر طرف سینکڑوں درویش دعا دیتے ہیں
کیونکہ اس راہ میں پا رکھیے کہ صاحب نظراں — یاں سے لے واں تئیں آنکھیں ہی بچھا دیتے ہیں
ملتے ہی آنکھ ملی اس کی تو پر ہم بے تہ — خاک میں آپ کو فی الفور ملا دیتے ہیں

طرفہ صناع ہیں اے میر یہ موزوں طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ بھی تو بنا دیتے ہیں

(135)

ایسے محروم گئے ہم تو گرفتارِ چمن — کہ موئے قید میں دیوار بہ دیوارِ چمن
سینے پر داغ کا احوال میں پوچھوں ہوں نسیم — یہ بھی تختہ کبھو ہووے گا سزاوارِ چمن
باغباں باغ اجاڑے ہی اگر دینا تھا — تھے زرِ داغ سے ہم بھی تو خریدارِ چمن
وے گنہگار ہمیں ہیں کہ جنھیں کہتے ہیں — عاشقِ زارِ چمن، مُرغِ گرفتارِ چمن
خون ٹپکے ہے پڑا نوک سے ہر یک کی ہنوز — کس ستم دیدہ کی مژگاں ہیں تہِ خارِ چمن
کم نہیں ہے دلِ پُر داغ بھی اے مُرغِ اسیر — گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلب گارِ چمن

کیا جزا ٹھہرتی ہے دیکھیے کل حشر کو میر
داغ ہر ایک مرے دل پہ ہے خوں دارِ چمن

(136)

بزم میں جو ترا ظہور نہیں — شمعِ روشن کے منہ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک — یاد رہتی ترے حضور نہیں
فکر مت کر ہمارے جینے کا — تیرے نزدیک کچھ یہ دور نہیں
پھر جئیں گے جو تجھ سا ہے جاں بخش — ایسا جینا ہمیں ضرور نہیں

عام ہے یار کی تجلی میر
خاصِ موسیٰ و کوہِ طور نہیں

(137)

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

بوئے گل اور رنگِ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدرِ یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

چشمِ سفید و اشکِ سرخ آہ دلِ حزیں ہے یاں
شیشہ نہیں ہے مے نہیں ابر نہیں ہوا نہیں

ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں

آب و ہوائے مُلکِ عشق تجربہ کی ہے میں بہت
کر کے دوائے دردِ دل کوئی بھی پھر جیا نہیں

نازِ بتاں اُٹھا چکا دَیر کو میرؔ ترک کر
کعبے میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

(138)

نہ نکلا دوسرا ویسا جہاں میں
وہی اک جنس ہے اس کارواں میں

کیا منہ بند سب کا بات کہتے
بلا کچھ سحر ہے اس کی زباں میں

اگر وہ بت نہ جانے تو نہ جانے
ہمیں سب جانے ہیں ہندوستاں میں

کھنچی رہتی ہے اس ابروئے خم سے
کوئی کیا شاخ نکلی ہے کماں میں

نیا ہے کیا شگوفہ یہ کہ اکثر
رہا ہے پھول پڑتا گلستاں میں

کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی
پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں

پھرے ہے چھانتا ہی خاک اے میرؔ
ہوس کیا ہے مزاج آسماں میں

(139)

دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اس سے لگ پڑیاں
مار رکھا سو ان نے مجھ کو کس ظالم سے جا لڑیاں

ایک نگہ میں مر جاتا ہے عاشق کو چک دل اس کا
زہر بھری کیا کام آتی ہیں گو وے آنکھیں ہوں بڑیاں

عقدے داغ دل کے شاید دست قدرت کھولے گا
ناخن سے تدبیر کے میری کھلتی نہیں یہ گل جھڑیاں

نحس تھے کیا وے وقت و ساعت جن میں لگا تھا دل اپنا
سال پہر ہے اب تو ہم کو ماہ برابر ہیں گھڑیاں

میر بلاے جان رہے ہیں دونوں فراق و وصل اس کے
ہجر کی راتیں وہ بھاری تھیں ملنے کے دن کی یہ کڑیاں

(140)

مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رہتا ہرگز
لوگ جو کچھ انھیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

عشق کے شہر کی بھی رسم کے ہیں کشتے ہم
درد جانکاہ جو ہو اس کو دوا کہتے ہیں

جی اگر زلفوں کے سودے میں ترے دوں تو نہ بول
پہلی قیمت کے تئیں مشک بہا کہتے ہیں

حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

(141)

عام حکم شراب کرتا ہوں
محتسب کو کباب کرتا ہوں

ٹک تو رہ اے بنائے ہستی تو
تجھ کو کیسا خراب کرتا ہوں

بحث کرتا ہوں ہو کے ابجد خواں
کس قدر بے حساب کرتا ہوں

سر تلک آب تیغ میں ہوں غرق
اب تئیں آب آب کرتا ہوں

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

(142)

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں آرزوے جہان ہوتے ہیں
گوشِ دیوار تک تو جا نالے اس میں گل کو بھی کان ہوتے ہیں
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
دشت کے پھوٹے مقبروں پہ نہ جا روضے سب گلستان ہوتے ہیں
غمزۂ چشم خوش قدانِ زمیں فتنۂ آسمان ہوتے ہیں
کیا رہا ہے مشاعرے میں اب لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں

میرؔ و مرزاؔ رفیع و خواجہؔ میر
کتنے اک یہ جوان ہوتے ہیں

(143)

آجائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں
یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت نہیں ہمیں یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں
حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں
اس بت کدے میں معنی کا کس سے کریں سوال آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یاں
عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں
ویسا چمن سے سادہ نکلتا نہیں کوئی رنگینی ایک اور خم و چم بہت ہے یاں
اعجازِ عیسوی سے نہیں بحث عشق میں تیری ہی بات جانِ مجسم بہت ہے یاں
میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمھیں تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں
دل مت لگا رخِ عرق آلودِ یار سے آئینے کو اٹھا کہ زمیں نم بہت ہے یاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میرؔ
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

(144)

لیتے ہیں سانس یوں ہم جوں تار کھینچتے ہیں
اب دل گرفتگی سے آزار کھینچتے ہیں

سینہ سپر کیا تھا جن کے لیے بلا کا
وے بات بات میں اب تلوار کھینچتے ہیں

مجلس میں تیری ہم کو کب غیر خوش لگے ہے
ہم بیچ اپنے اُس کے دیوار کھینچتے ہیں

بے طاقتی نے ہم کو چاروں طرف سے کھویا
تصدیع گھر میں بیٹھے ناچار کھینچتے ہیں

منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی
حق جو کہے ہے اس کو یاں دار کھینچتے ہیں

شکوہ کروں تو کس سے کیا شیخ کیا برہمن
ناز اس بلاے جاں کے سب یار کھینچتے ہیں

ناوک سے میر اُس کے دل بستگی تھی مجھ کو
پیکاں جگر سے میرے دشوار کھینچتے ہیں

(145)

کہے تو ہم نشیں رنگ تصرف کچھ دکھاؤں میں
الگ بیٹھا حنا بندوں کو آنکھوں میں رچاؤں میں

نہیں ہوں بے ادب اتنا کہ گل سے منھ لگاؤں میں
جگر ہو ٹکڑے ٹکڑے گر چمن کی اور جاؤں میں

کیا ہے اضطراب دل نے کیا مجھ کو سبک آخر
کہاں تک یار کے کوچے سے جا جا کر پھر آؤں میں

وفا صد کارواں رکھتا ہوں لیکن شہر خوبی میں
خریداری نہیں مطلق کہاں جا کر بکاؤں میں

(146)

بھلا ہوا کہ دل مضطرب میں تاب نہیں
بہت ہی حال برا ہے اب اضطراب نہیں

جگر کا لوہو جو پانی ہو بہہ نکلتا تھا
سو ہو چکا کہ مری چشم اب پُر آب نہیں

حساب پاک ہو روز شمار میں تو عجب
گناہ اتنے ہیں میرے کہ کچھ حساب نہیں

جہاں کے باغ کا یہ عیش ہے کہ گل کے رنگ
ہمارے جام میں لوہو ہے سب شراب نہیں

تلاش میر کی اب میکدوں میں کاش کریں
کہ مسجدوں میں تو وہ خانماں خراب نہیں

(147)

ٹھنڈی سانسیں بھریں ہیں جلتے ہیں کیا تاب میں ہیں ۔۔۔ دل کے پہلو سے ہم آتش میں ہیں اور آب میں ہیں
ساتھ اپنے نہیں اسباب مساعد مطلق ۔۔۔ ہم بھی کہنے کے تئیں عالم اسباب میں ہیں
غفلت دل سے ستم گزریں ہیں سو مت پوچھو ۔۔۔ قافلے چلنے کو تیار ہیں ہم خواب میں ہیں
عشق کے ہیں گے جو سرگشتہ پڑے ہیں ڈوبے ۔۔۔ کشتیاں نکلیں سو کیا آن کے گرداب میں ہیں
دوری کیا اس سے جو بیٹھے ہے غبار اپنا دور ۔۔۔ پاس اس طور کے بھی عشق کے آداب میں ہیں
ہے فروغ مہ تاباں سے فراغ کلی ۔۔۔ دل جلے پرتو رخ سے ترے مہتاب میں ہیں

ہم بھی اس شہر میں ان لوگوں سے ہیں خانہ خراب
میرؔ گھر بار جنھوں کے رہ سیلاب میں ہیں

(148)

تجھے بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں ۔۔۔ ولے کم ہیں بہت دے لوگ جن کو یار کہتے ہیں
سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح! ۔۔۔ وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں
تری آنکھوں کو آؤں دیکھنے میں تو عجب مت کر ۔۔۔ کہ بہتر ہے عیادت اور انھیں بیمار کہتے ہیں
عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں ۔۔۔ کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں
مزے اُن کے اُڑا لیکن نہ یہ سمجھیں تو بہتر ہے ۔۔۔ کہ خوباں بھی بہت اپنے تئیں عیار کہتے ہیں

(149)

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں ۔۔۔ کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر ۔۔۔ یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا ۔۔۔ مری آہ نے برچھیاں ماریاں
گیا جان سے اک جہاں لیک شوخ ۔۔۔ نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز ۔۔۔ ہوئیں دامِ رہ صد گرفتاریاں

کیا درد و غم نے مجھے نا امید — کہ مجنوں کو یہ ہی تھیں بیماریاں
تری آشنائی سے ہی حد ہوئی — بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں!
کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں

(150)

لب ترے لعلِ ناب ہیں دونوں — پر تمامی عتاب ہیں دونوں
بے تکلف نقاب دے رُخسار — کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں
تن کے معمورے میں یہی دل و چشم — گھر تھے دو سو خراب ہیں دونوں
کچھ نہ پوچھو کہ آتشِ غم سے — جگر و دل کباب ہیں دونوں
سو جگہ اس کی آنکھیں پڑتی ہیں — جیسے مستِ شراب ہیں دونوں
ایک سب آگ ایک سب پانی — دیدۂ و دل عذاب ہیں دونوں
بحث کاہے کو لعل و مرجاں سے — اس کے لب ہی جواب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

(151)

مباد کینے پہ اُس بُت کی طبع آئی ہو — پھر ایک بس ہے وہی گو اُدھر خدائی ہو
مدد نہ اتنی بھی کی بختِ ناموافق نے — کہ مدعی سے اسے ایک دن لڑائی ہو
ہنوز طفل ہے وہ ظلم پیشہ کیا جانے — لگاوے تیغ سلیقے سے جو لگائی ہو
لبوں سے تیرے تھا آگے ہی لعل سرخ وہ زرد — قسم ہے میں نے اگر بات بھی چلائی ہو
اُس آفتاب سے تو فیض سب کو پہنچے ہے — یقین ہے کہ کچھ اپنی ہی نا رسائی ہو
کبھو ہے چھیڑ کبھو گالی ہے کبھو چشمک — بیان کریے جو ایک اُس کی بے ادائی ہو
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے — اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو
جو کوئی دم ہو تو لوہو سا پی کے رہ جاؤں — غموں کی دل میں بھلا کب تلک سمائی ہو
مغاں سے راہ تو ہو جائے رفتہ رفتہ شیخ — ترا بھی قصد اگر ترکِ پارسائی ہو

(152)

خط لکھ کے کوئی سادہ نہ اس کو ملول ہو — ہم تو ہوں بدگمان جو قاصد رسول ہو
چاہوں تو بھر کے کولی اٹھالوں ابھی تمھیں — کیسے ہی بھاری ہو مرے آگے تو پھول ہو
سرمہ جو نور بخشے ہے آنکھوں کو خلق کی — شاید کہ راہِ یار کی ہی خاک دھول ہو
جاویں نثار ہونے کو ہم کس بساط پر — اک نیم جاں رکھیں ہیں سو وہ جب قبول ہو
ناکام اس لیے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج
تم بھی تو میرؔ صاحب و قبلہ عجول ہو

(153)

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو — ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم — اس سے کیا دل نہاد ہے ہم کو
خط سے نکلے ہے بے وفائیِ حسن — اس قدر تو سواد ہے ہم کو
آہ کس ڈھب سے رویئے کم کم — شوق حد سے زیاد ہے ہم کو
شیخ و پیرِ مغاں کی خدمت میں — دل سے اک اعتقاد ہے ہم کو

(154)

اس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو — جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو
کہیں پہنچوگے بے رہی میں بھی — گم رہاں یوں یہ راہ مت پوچھو
نو گرفتارِ دامِ زلف اس کا — ہے یہی رُو سیاہ مت پوچھو
ہیں گی برگشتہ وے صفِ مژگاں — پھر گئی ہے سپاہ مت پوچھو
تھا کرم پر اسی کے شربِ مدام — میرے اعمال آہ مت پوچھو
تم بھی اے مالکانِ روزِ جزا — بخش دو اب گناہ مت پوچھو
میرؔ عاشق کو کچھ کہے ہی بنے
خواہ وہ پوچھو خواہ مت پوچھو

(155)

قد کھینچے ہے جس وقت تو ہے طرفہ بلا تو
کہتا ہے ترا سایہ پری سے کہ ہے کیا تو
گر اپنی روش راہ چلا یار تو اے کبک
رہ جائے گا دیوار گلستان سے لگا تو
کیا جانیے اے گوہر مقصد تو کہاں ہے
ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملا تو
تھے چاک گریبان گلستاں میں گلوں کے
نکلا ہے مگر کھولے ہوئے بندِ قبا تو

(156)

اے چرخ مت حریف اندوہِ بے کساں ہو
کیا جانے منھ سے نکلے نالے کے کیا سماں ہو
ہم دُور ماندگاں کی منزل رسا مگر اب
یا ہو صدا جرس کی یا گرد کارواں ہو
تاچند کوچہ گردی جیسے صبا زمیں پر
اے آہِ صبح گاہی آشوب آسماں ہو
پتھر سے توڑ ڈالوں آئینے کو ابھی میں
گر روئے خوبصورت تیرا نہ درمیاں ہو
گر ذوقِ سیر ہے تو آوارہ اس چمن میں
مانند عندلیب گم کردہ آشیاں ہو

(157)

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیر بیاباں کو
نکالا سر سے میرے جائے مو، خار مغیلاں کو
تجھے گر چشم عبرت ہے تو آندھی اور بگولے سے
تماشا کر غبار افشانیِ خاک عزیزاں کو
نہیں ریگِ رواں، مجنوں کے دل کی بے قراری نے
کیا ہے مضطرب ہر ذرۂ گرد بیاباں کو
کسی کے واسطے رُسوائے عالم ہو، یہ جی میں رکھ
کہ مارا جائے جو ظاہر کرے اس رازِ پنہاں کو

(158)

ویسا کہاں ہے ہم سے جیسا کہ آگے تھا تُو ۔ اوروں سے مل کے پیارے کچھ اور ہو گیا تُو

آ ابر ایک دو دم آپس میں رکھیں صحبت ۔ کڑھنے کو ہوں میں آندھی رونے کو ہے بلا تو

آتی بخود نہیں ہے بادِ بہار اب تک ۔ دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو

کہہ سانجھ کے موئے کو اے میرؔ روئیں کب تک

جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

(159)

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو ۔ آرزو ہے کہ تُم ادھر دیکھو

عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے ۔ آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو

یوں عرق جلوہ گر ہے اس منہ پر ۔ جس طرح اوس پھول پر دیکھو

ہر خراش جبیں جراحت ہے ۔ ناخنِ شوق کا ہُنر دیکھو

تھی ہمیں آرزو نے لب خنداں ۔ سو عوض اس کے چشم تر دیکھو

رنگ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہے ۔ ایک شب اور یاں سحر دیکھو

دل ہوا ہے طرف محبت کا ۔ خون کے قطرے کا جگر دیکھو

پہنچے ہیں ہم قریب مرنے کے ۔ یعنی جاتے ہیں دور اگر دیکھو

لُطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میرؔ

دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

(160)

دل صاف ہو تو جلوہ گہِ یار کیوں نہ ہو ۔ آئینہ ہو تو قابلِ دیدار کیوں نہ ہو

رحمت غضب میں نسبت برق و سحاب ہے ۔ جس کو شعور ہو تو گنہ گار کیوں نہ ہو

آیات حق ہیں سارے یہ ذرات کائنات — انکار تجھ کو ہووے سو اقرار کیوں نہ ہو
ہر دم کی تازہ مرگ جدائی سے تنگ ہوں — ہونا جو کچھ ہے آہ سو یکبار کیوں نہ ہو
موے سفید ہم کو کہے ہے کہ غافلاں — اب صبح ہونے آئی ہے بیدار کیوں نہ ہو

(161)

جب ملنے کا سوال کروں ہوں، زلف و رُخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یوں ہی گزرے، صبح و شام بتاتے ہو
بکھری رہے ہیں منھ پر زلفیں، آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
کیونکہ چھپے میخواریِ شب جب ایسے رات کے ماتے ہو
سرو تہ و بالا ہوتا ہے، درہم برہم شاخِ گُل
ناز سے قد کش ہو کے چمن میں، ایک بلا تم لاتے ہو
صبح سے یاں پھر جان و دل پر روز قیامت رہتی ہے
رات کبھو آ رہتے ہو تو یہ دن ہم کو دکھاتے ہو

(162)

کھنچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ — ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ
دل نہیں جمع چشم تر سے اب — پھیلتا سا چلا یہ دریا کچھ
شہر میں حشر کیوں نہ برپا ہو — شور ہے میرے سر میں کیا کیا کچھ
ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا — کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ
خلق کی کیا سمجھ میں وہ آیا — آپ سے تو گیا نہ سمجھا کچھ
وصل اس کا خدا نصیب کرے — میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

(163)

سو ظلم کے رہتے ہیں سزاوار ہمیشہ
ہم بے گنہ اس کے ہیں گنہ گار ہمیشہ

اک آن گزر جائے تو کہنے میں کچھ آوے
درپیش ہے یاں مُردنِ دُشوار ہمیشہ

یوسفؑ سے کئی آن کے تیرے سرِ بازار
بک جاتے ہیں باتوں میں خریدار ہمیشہ

ہے دامنِ گل چینِ چمن جیب ہمارا
دنیا میں رہے دیدۂ خوں بار ہمیشہ

جو بن ترے دیکھے موا دوزخ میں ہے یعنی
رہتی ہے اُسے حسرتِ دیدار ہمیشہ

جینا ہے تو بے طاقتی و بے خودی ہے میرؔ
مردہ ہے غرض عشق کا بیمار ہمیشہ

(164)

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ
وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

بودِ آدم نمودِ شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا
دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ

شور سے اپنے حشر ہے پَر وہ
یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ

بس ہوا ناز ہو چکا اغماض
ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ

نعشیں اٹھتی ہیں آج یاروں کی
آن بیٹھو تو خوش نما ہے یہ

(165)

اب حال اپنا اس کے ہے دل خواہ
کیا پوچھتے ہو الحمدللہ

مر جاؤ کوئی پروا نہیں ہے
کتنا ہے مغرور اللہ اللہ

پیرِ مغاں سے بے اعتقادی
استغفراللہ استغفراللہ

حضرت سے اس کی جانا کہاں ہے
اب مر رہے گا یاں بندہ درگاہ

مجرم ہوئے ہم دل دے کے ورنہ　　کس کو کسو سے ہوتی نہیں چاہ
اس پر کہ تھا وہ شہ رگ سے اقرب　　ہرگز نہ پہنچا یہ دستِ کوتاہ
ہے ما سوا کیا جو میر کہیے　　کیا روز کیا خور کیا رات کیا ماہ

(166)

دل پرخوں ہے یہاں تجھ کو گماں ہے شیشہ　　شیخ کیوں مست ہوا ہے تو کہاں ہے شیشہ
شیشہ بازی تو تنک دیکھنے آ آنکھوں کی　　ہر پلک پر مرے اشکوں سے رواں ہے شیشہ
منزلِ مستی کو پہنچے ہے انھیں سے عالم　　نشۂ مے بلد و سنگ نشاں ہے شیشہ
جا کے پوچھا جو میں یہ کارگہِ مینا میں　　ق　دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ
کہنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست　　ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ
دل ہی سارے تھے پہ اک وقت میں جو کرکے گداز　　شکل شیشے کی بنائے ہیں کہاں ہے شیشہ

جھک گیا دیکھ کے میں میر اسے مجلس میں
چشمِ بد دور طرح دار جواں ہے شیشہ

(167)

کیا کروں شرح خستہ جانی کی　　میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بدگفتنی نہیں میرا　　تم نے پوچھا تو مہربانی کی
تشنہ لب مر گئے ترے عاشق　　نہ ملی ایک بوند پانی کی
بیت بحثی سمجھ کے کر بلبل　　دھوم ہے میری خوش زبانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل
ابتداء پھر وہی کہانی کی

(168)

اب ہم فقیر جی سے دل کو اٹھا کے بیٹھے
اس خصم جاں کے در پر تکیہ بنا کے بیٹھے

عزلت نشیں ہوئے جب دل داغ ہو گیا تب
یعنی کہ عاشقی میں ہم گھر جلا کے بیٹھے

جو کفر جانتے تھے عشق بتاں کو وہ ہی
مسجد کے آگے آخر قشقہ لگا کے بیٹھے

شور متاع خوبی اس شوخ کا بلا تھا
بازاری سب دکانیں اپنی بڑھا کے بیٹھے

کیا اپنی اور اس کی اب نقل کریے صحبت
مجلس سے اٹھ گیا وہ تک ہم جو آ کے بیٹھے

کیا جانے تیغ اس کی کب ہو بلند عاشق
یوں چاہیے کہ سر کو ہر دم جھکا کے بیٹھے

وادی قیس سے پھر آئے نہ میر صاحب
مرشد کے ڈھیر پر وے شاید کہ جا کے بیٹھے

(169)

مجنوں و کوہکن کو آزار ایسے ہی تھے
یہ جان سے گئے سب بیمار ایسے ہی تھے

شمس و قمر کے دیکھے جی اس میں جا رہے ہے
اس دل فروز کے بھی رخسار ایسے ہی تھے

دامن کے پاٹ سارے تختے ہوئے چمن کے
بس اے سرشک خونیں درکار ایسے ہی تھے

لوہو نہ کیوں رلائے ان کا گداز ہونا
یہ دل جگر ہمارے غم خوار ایسے ہی تھے

ہر دم جراحت آسا کب رہتے تھے ٹپکتے
یہ دیدۂ نمیں کیا خوں بار ایسے ہی تھے

آزاردہ دلوں کا جیسا کہ تو ہے ظالم
اگلے زمانے میں بھی کیا یار ایسے ہی تھے

ہو جائے کیوں نہ دوزخ باغ زمانہ ہم پر
ہم بے حقیقتوں کے کردار ایسے ہی تھے

دیوار سے پٹک سر میں جو موا تو بولا
کچھ اس ستم زدہ کے آثار ایسے ہی تھے

اک حرف کا بھی ان کو دفتر ہے کر دکھانا
کیا کہیے میر جی کے بستار ایسے ہی تھے

ایک سمیں تم ہم فقرا سے اکثر صحبت رکھتے تھے
اور نہ تھی توفیق تمھیں تو بوسے کی ہمت رکھتے تھے
اب تو ہم ہو چکتے ہیں ٹک تیرے ابرو خم ہوتے
کیا کیا رنج اٹھاتے تھے جب جی میں طاقت رکھتے تھے
چاہ کے سارے دیوانے پر آپ سے اکثر بیگانے
عاشق اس کے میر کیے ہم سب سے جدی مت رکھتے تھے
ہم تو سزاے تیغ ہی تھے پر ظلم بے حد کیا معنی
اور بھی تجھ سے آگے ظالم اچھی صورت رکھتے تھے
آج غزال اک رہبر ہوکر لایا تربت مجنوں پر
قصد زیارت رکھتے تھے ہم جب سے وحشت رکھتے تھے
کس دن ہم نے سر نہ چڑھا کر ساغر مے کو نوش کیا
دور میں اپنے دختر رز کی ہم اک حرمت رکھتے تھے
کوہکن و مجنون و وامق کس کس کے لیں نام غرض
جی ہی سے جاتے آگے سنے وے لوگ جو الفت رکھتے تھے
چشم جہاں تک جاتی تھی گل دیکھتے تھے ہم سرخ و زرد
پھول چمن کے کس کے منھ سے ایسی خجلت رکھتے تھے
کام کرے کیا سعی و کوشش مطلب یاں ناپیدا تھا
دست و پا بہتیرے مارے جب تک قدرت رکھتے تھے
چتون کے کب ڈھب تھے ایسے چشمک کے تھے کب یہ ڈول
ہائے رے وے دن جن روزوں تم کچھ بھی مروت رکھتے تھے
لعل سے جب دل تھے یہ ہمارے مرجاں سے تھے اشک چشم
کیا کیا کچھ پاس اپنے ہم بھی عشق کی دولت رکھتے تھے
کل کہتے ہیں اس بستی میں میر جی مشتاقانہ موئے
تجھ سے کیا ہی جان کے دشمن وے بھی محبت رکھتے تھے

(171)

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی

گل بار کرے ہے گا اسبابِ سفر شاید غنچے کی طرح بُلبُل دیگر نظر آئی

(172)

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے یہ دُھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک شعلہ اک صبح یاں سے اُٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے

نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا شور اک آسماں سے اٹھتا ہے

لڑتی ہے اُس کی چشمِ شوخ جہاں ایک آشوب واں سے اُٹھتا ہے

سُدھ لے گھر کی بھی شعلۂ آواز دود کچھ آشیاں سے اُٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے

یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے

(173)

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

برنگِ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری

اُسی سے دُور رہا اصلِ مُدّعا جو تھا گئی یہ عمرِ عزیز آہ رائیگاں میری

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

(174)

اب کے بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی — اپنی جگہ بہار میں کنجِ قفس رہی

میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے تلک — آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی

دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے — برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی

جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے — فرصت رہی جو میرؔ بھی سو اک نفس رہی

(175)

اب کرکے فراموش تو ناشاد کروگے — پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے

زنہار اگر خستہ دلاں بیستوں جاؤ — ٹک پاس ہنر مندیٔ فرہاد کروگے

غیروں پہ اگر کھینچو گے شمشیر تو خوباں — اک اور مری جان پہ بیداد کروگے

جا کہ نہیں یاں رویئے جس پر نہ کھڑے ہو — کچھ شور ہی شر پر تو مجھے یاد کروگے

اس دشت میں اے راہ رواں ہر قدم اوپر — مانندِ جرس نالہ و فریاد کروگے

(176)

گزارِ خوش نگاہاں جس میں ہے میرا بیاباں ہے — سوادِ بزِ مجنوں تو چراگاہِ غزالاں ہے

کرے ہے خندۂ دنداں نما تو میں بھی روؤں گا — چمکتی زور ہے بجلی مقرر آج باراں ہے

چمن پر نوحہ و زاری سے کس گل کا یہ ماتم ہے — جو شبنم ہے تو گریاں ہے جو بلبل ہے تو نالاں ہے

ہر اک مژگاں پہ میری اشک کے قطرے جھمکتے ہیں — تماشا مفت خوباں ہے لب دریا چراغاں ہے

کیا تھا جابجا رنگیں لہو تجھ ہجر میں روکر
گریباں میرؔ کا دیکھا، مگر گلچیں کا داماں ہے

(177)

پیری میں کیا جوانی کے موسم کو روئیے ‏ ‏ ‏ ‏ اب صبح ہونے آئی ہے اک دم تو سوئیے

اخلاصِ دل سے چاہیے سجدہ نماز میں ‏ ‏ ‏ ‏ بے فائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئیے

کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم کشاں ‏ ‏ ‏ ‏ اس آبِ گرم میں تو نہ انگلی ڈبوئیے

اب جانِ جسمِ خاکی سے تنگ آگئی بہت ‏ ‏ ‏ ‏ کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

آلودہ اُس گلی کی جو ہوں خاک سے تو میؔر
آبِ حیات سے بھی نہ وے پانو دھوئیے

(178)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے ‏ ‏ ‏ ‏ پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں ‏ ‏ ‏ ‏ حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز ‏ ‏ ‏ ‏ اُسی خانہ خراب کی سی ہے

میؔر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

(179)

عمر بھر ہم رہے شرابی سے ‏ ‏ ‏ ‏ دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے

جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ ‏ ‏ ‏ ‏ رات گزرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

برقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا ‏ ‏ ‏ ‏ داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

(180)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

(181)

جب تک کہ ترا گزر نہ ہووے
جلوہ مری گور پر نہ ہووے

لے تیغ و سپر کو تو جدھر ہو
خورشید کا منہ ادھر نہ ہووے

رونے کی ہے جاگہ آہ کریے
پھر دل میں ترے اثر نہ ہووے

بیمار رہیں ہیں اس کی آنکھیں
دیکھو کسو کی نظر نہ ہووے

رُکتی نہیں تیغ نالہ ہرگز
جب تک کہ جگر سپر نہ ہووے

کر بے خبر اک نگہ سے ساقی
لیکن کسو کو خبر نہ ہووے

خستے ترے موئے عنبریں کے
کیوں جیویں صبر گر نہ ہووے

رکھ دیکھ کے راہِ عشق میں پاؤں
یاں میرؔ کسو کا سر نہ ہووے

(182)

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

ہوتا نہیں ہے اُس لبِ نو خط پہ کوئی سبز
عیسیٰ و خضر کیا سبھی یک بار مر گئے

یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آہ
سر کو پٹک کے ہم پسِ دیوار مر گئے

صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں
گویا متاعِ دل کے خریدار مر گئے

مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں
تھا جن سے لطفِ زندگی وے یار مر گئے

افسوس وے شہید کہ جو قتل گاہ میں
لگتے ہی اس کے ہاتھ کی تلوار مر گئے

(183)

آہ جس وقت سر اٹھاتی ہے
عرش پر برچھیاں چلاتی ہے

نازبردارِ لب ہے جاں جب سے
تیرے خط کی خبر کو پاتی ہے

اے شبِ ہجر راست کہہ تجھ کو
بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

چشمِ بد دور چشمِ تر اے میرؔ
آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہے

(184)

طاقت نہیں ہے دل میں نے جی بجا رہا ہے
کیا ناز کر رہے ہو اب ہم میں کیا رہا ہے

جیب اور آستیں سے رونے کا کام گزرا
سارا نچوڑ اب تو دامن پر آ رہا ہے

گرد رہ اُس کی یارب کس اور سے اٹھے گی
سو سو غزال ہر سو آنکھیں لگا رہا ہے

دیکھ اس دہن کو ہر دم اے آرسی کہ یوں ہی
خوبی کا در کسو کے منہ پر بھی وا رہا ہے

وے لطف کی نگاہیں پہلے فریب ہیں سب
کس سے وہ بے مروت پھر آشنا رہا ہے

اتنا خزاں کرے ہے کب زرد رنگ پر یاں
تو بھی مری نگہ سے اے گل جدا رہا ہے

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر
جینے کا اس سمیں میں اب کیا مزا رہا ہے

(185)

برنگِ بُوے گُل اُس باغ کے ہم آشنا ہوتے
کہ ہمراہِ صبا ٹک سیر کرتے پھر ہوا ہوتے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اس میں ہم غبار راہ ہوتے یا کسو کی خاک پا ہوتے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

(186)

اے ہم صفیر! بے گل کس کو دماغ نالہ مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے
شمعِ اخیر شب ہوں سُن سرگذشت میری پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے
تو ہی زمام اپنی ناقے تُڑا کہ مجنوں مدت سے نقش پا کے مانند راہ پر ہے
آفت رسیدہ ہم کیا سر کھینچیں اس چمن میں جوں نخلِ خشک ہم کو نے سایہ نے ثمر ہے

(187)

فکر ہے ماہ کے جو شہر بدر کرنے کی ہے سزا تجھ پہ یہ گستاخ نظر کرنے کی
کہہ حدیث آنے کی اُس کے جو کیا شادی مرگ نامہ بر کیا چلی تھی ہم کو خبر کرنے کی
کیا جلی جاتی ہے خوبی ہی میں اپنی اے شمع کہہ پتنگے کے بھی کچھ شام و سحر کرنے کی
اب کی برسات ہی کے ذمے تھا عالم کا وبال میں تو کھائی تھی قسم چشم کے تر کرنے کی
عشق میں تیرے گزرتی نہیں بن سر پٹکے صورت اک یہ رہی ہے عمر بسر کرنے کی
کاروانی ہے جہاں عُمرِ عزیز اپنی میر
رہ ہے درپیش سدا اُس کو سفر کرنے کی

(188)

میں نے جو بے کسانہ مجلس میں جان کھوئی سر پر مرے کھڑی وہ شب شمع زور روئی
بے طاقتی سے آگے کچھ پوچھتا بھی تھا سو رونے نے ہر گھڑی کے وہ بات ہی ڈبوئی
بلبل کی بے کلی نے شب بے دماغ رکھا سونے دیا نہ ہم کو ظالم نہ آپ سوئی

اُس ظلم پیشہ کی یہ رسمِ قدیم ہے گی   غیروں پر مہربانی یاروں سے کینہ جوئی
اُس مہہ کے جلوے سے کچھ تا میر یاد دیوے
اب کی گھروں میں ہم نے سب چاندنی ہے بوئی

(189)

اب میر جی تو اچھے زندیق ہی بن بیٹھے   پیشانی پہ دے قشقہ زنار پہن بیٹھے
آزردہ دلِ الفت ہم چپکے ہی بہتر ہیں   سب رو اُٹھے گی مجلس جو کر کے سُخن بیٹھے
پیکانِ خدنگ اس کا یوں سینے کے اودھر ہے   جوں مارسیہ کوئی کاڑھے ہوئے پھن بیٹھے
شمشیر ستم اس کی اب گو کہ چلے ہردم   شوریدہ سر اپنے سے ہم باندھ کفن بیٹھے
بس ہو تو ادھر اودھر یوں پھرنے نہ دیں تجھ کو
ناچار ترے ہم یہ دیکھیں ہیں چلن بیٹھے

(190)

یا بادۂ گلگوں کی خاطر سے ہوس جاوے   یا ابر کوئی آوے اور آکے برس جاوے
شورش کدۂ عالم کہنے ہی کی جاگہ تھی   دل کیا کرے جو ایسے ہنگامے میں پھنس جاوے
دل ہے تو عبث نالاں یارانِ گزشتہ بن   ممکن نہیں اب اُن تک آواز جرس جاوے
اُس زُلف سے لگ چلنا اک سانپ کھلانا ہے   یہ مارسیہ یارو ناگاہ نہ ڈس جاوے
ہے میر عجب کوئی درویش برشتہ دل
بات اُس کی سنو تم تو چھاتی بھی جھلس جاوے

(191)

کیا کہیے کلی سا وہ دہن ہے   اس میں کہاں سوچے سخن ہے
وابستگی مجھ سے شیشہ جاں کی   اس سنگ سے ہے کہ دل شکن ہے

لطف اس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو
کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے

وے بندِ قبا کھلے تھے شاید
صد چاک گلوں کا پیرہن ہے

گہہ دیر میں ہیں گہے حرم میں
اپنا تو یہی دوانہ پن ہے

ہم کشتۂ عشق ہیں ہمارا
میدان کی خاک ہی کفن ہے

کر میرؔ کے حال پر ترحم
وہ شہر غریب و بے وطن ہے

(192)

ہم مست بھی ہو دیکھا آخر مزا نہیں ہے
ہشیاری کے برابر کوئی نشا نہیں ہے

ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو
تیرے سوائے میرا کچھ مدعا نہیں ہے

زیرِ فلک رکا ہے اب جی بہت ہمارا
اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے

تھیں پیش از آشنائی کیا آشنا نگاہیں
اب آشنا ہوئے پر آنکھ آشنا نہیں ہے

(193)

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

منعِ گریہ نہ کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

نالے کریو سمجھ کے اے بلبل
باغ میں یک کنار ہیں ہم بھی

مدعی کو شراب ہم کو زہر
عاقبت دوست دار ہیں ہم بھی

گر زخود رفتہ ہیں ترے نزدیک
اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی

میرؔ نام اک جواں سُنا ہوگا
اُسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی

(194)

غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی
اے عُمرِ گزشتہ میں تری قدر نہ جانی

تھی آبلۂ دل سے ہمیں تشنگی میں چشم
پھوٹا تو نہ آیا نظر اک بُوند بھی پانی

مدت سے ہیں اک مُشت پر آوارہ چمن میں
نکلی ہے یہ کس کی ہوسِ بال فشانی

دیکھیں تو سہی کب تئیں نبھتی ہے یہ صحبت
ہم جی سے ترے دوست ہیں تو دشمنِ جانی

مجنوں بھی نہ رسوائے جہاں ہوتا نہ وہ آپ
مکتب میں جو کم آتی ہے لیلیٰ تھی دِوانی

اک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھ پہ تھا عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی

یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سُنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

(195)

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

جرس راہ میں جملہ تن شور ہے
مگر قافلے سے کوئی دور ہے

تمنائے دل کے لیے جان دی
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

نہ ہو کس طرح فکرِ انجام کار
بھروسا ہے جس پر سو مغرور ہے

پلک کی سیاہی میں ہے وہ نگاہ
کسو کا مگر خون منظور ہے

دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج
گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے

کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل
وہی بے قراری بدستور ہے

نہ دیکھا کہ لوہو تھمبا ہو کبھو
مگر چشمِ خوں بار ناسور ہے

تنک گرم تو سنگ ریزے کو دیکھ
نہاں اس میں بھی شعلۂ طور ہے

بہت سعی کریے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

(196)

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے — پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز — وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

کیا سمجھے اس کے مرتبہ عالی کو اہلِ خاک — پھرتے ہیں جوں سپہر بہت ہم ورے ورے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر — بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

(197)

لا علاجی سے جو رہتی ہے مجھے آوارگی — کیجیے کیا میر صاحب بندگی بے چارگی

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یک بارگی

روئے گل پر روز و شب کس شوق سے رہتا ہے باز — رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی

اشکِ خونیں آنکھ میں بھر لا کے پی جاتا ہوں میں — محتسب رکھتا ہے مجھ پر تہمتِ مے خوارگی

مت فریب سادگی کھا ان سیہ چشموں کا میر
ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے بڑی عیارگی

(198)

چمن یار تیرا ہوا خواہ ہے — گل اک دل ہے جس میں تری چاہ ہے

سراپا میں اُس کے نظر کر کے تم — جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ ہے

تری آہ کس سے خبر پائیے — وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے

گزر سر سے تب عشق دکھلائیے — کہ ہر گام یاں اک خطرگاہ ہے

کبھو وادیِ عشق دکھلائیے — بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے

جہاں سے تو رختِ اقامت کو باندھ — یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

یہ وہ کارواں گاہِ دل کش ہے میر
کہ پھر یاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے

(199)

ڈھب ہیں تیرے سے باغ میں گل کے   بو گئی کچھ دماغ میں گل کے
جائے روغن دیا کرے ہے عشق   خونِ بلبل چراغ میں گل کے
دل تسلی نہیں صبا ورنہ   جلوے سب ہیں گے داغ میں گل کے
اس حدیقے کے عیش پر مت جا   مے نہیں ہے ایاغ میں گل کے

(200)

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے   ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے
لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر   شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
آرزو اس بلند و بالا کی   کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی   کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ   کیا دوا نے موت پائی ہے

(201)

کارِ دل اُس مہِ تمام سے ہے   کاہش اک روز مجھ کو شام سے ہے
تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب   شہر پُر شور اس غلام سے ہے
شعر میرے ہیں سب خواص پسند   پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

(202)

کیا حال بیاں کریے عجب طرح پڑی ہے   وہ طبع سے نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے
کیا نقش میں مجنوں ہی کے تھی رنگیِ عشق   لیلیٰ کی بھی تصویر تو حیران کھڑی ہے

جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے　　ہر تارِ نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے
وہ زلف نہیں منعکس دیدۂ تر میر　　اس بحر میں تہ داری سے زنجیر پڑی ہے

(203)

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے
رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چُواتے ہیں
آگے ہو میخانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے
عشق کے میداں داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت
یعنی مصیبت ایسی اُٹھانا کارِ کارگزاراں ہے
دل ہے داغ، جگر ہے ٹکڑے، آنسو سارے خون ہوئے
لُوہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ عذاراں ہے
کوہ کن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میر نہایت پاسِ عزت داراں ہے

رباعیات

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں لکھنؤ کی یہ خلقت
اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

•

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

•

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اپنے کمال پر جسے کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

•

قطعات

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

•

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چُور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

•

جانا نہیں کچھ جز غزل آ کر کے جہاں میں
کل میرے تصرّف میں یہی قطعہ زمیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے اُنھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

•

میرؔ دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

خاطرِ بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اڑانی اس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مینھ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی

کچھ لکھا ہے تجھے ہر برق پہ اے رشکِ بہار
رقعہ واریں ہیں یہ اوراق خزانی اس کی

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی

●

شہر آشوب

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرز معاش
ہے لب ناں پہ سو جگہ پر خاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

شور مطلق نہیں کسو سر میں
زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں
خانہ جنگی سے امن لشکر میں
نہ کوئی رند نے کوئی اوباش

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس
پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس
رعب کر لیجیے یہیں سے قیاس
قصہ کوتاہ رئیس ہے عیاش

چار لچے میں مستعدِ کار
دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار
لوٹ سے کچھ ہے گرمی بازار

سو بھی قندِ سیاہ ہے یا حاش

بس قلم اب زباں کو اپنی سنبھال
خوشنما کب ہے ایسی قال و مقال
ہے کذھب چرخِ روسیہ کی چال
مصلحت ہے کہ رہیے ہوکر لال

فائدہ کیا جو راز کریے فاش

ایک مثنوی پارہ

عجب رنگ پر شعلہ رخسار کا
مگر وہ تھا آئینہ گلزار کا
جو آنکھ اس کی بنی سے جاکر لڑے
دمِ تیغ پر راہ چلنی پڑے
مکاں کنج لب خواہش جان کا
تبسم سبب کاہش جان کا
دہن دیکھ کر کچھ نہ کہیے کہ آہ
سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ
سزا ہے جگر اس کسو کے لیے
جو سیب ذقن اس کا بوکر جیے
گل تازہ شرمندہ اس رو سے ہو
خجل مشک ناب اس کے گیسو سے ہو
سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے
کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے
کہیں بادۂ حسن سے مست ہے
کہیں نقشِ دیوار دیکھا اسے
کہیں گرم رفتار دیکھا اسے

کہیں دل بری اس کو درپیش ہے
کہیں مائل خوبی خویش ہے
کہیں جملہ تن مہر صرف سکوں
کہیں مجھ سے سر گرم حرف سکوں
کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز
کہیں ایستادہ بصد رنگ ناز
رہے سامنے اس طرح پر کبھو
رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو
بغل میں کبھو آرمیدہ رہے
کبھو اپنے بر خویش چیدہ رہے
کبھو صورتِ دل کش اپنی دکھائے
کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے
کبھو گرم کینہ کبھو مہرباں
کبھو دوست نکلے کبھو خصم جاں
کبھو یک بہ یک پار ہو جائے وہ
کبھو دست بردار ہو جائے وہ

(مثنوی خواب و خیال)